بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

؟؟

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کو اس وقت نہ صرف پاک و ہند بلکہ پورے عالم میں ایک ممتاز عالم دین اور خادم و داعیٔ قرآن کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور دنیا بھر میں آپ کے دروسِ قرآن آڈیو/ویڈیو کیسٹس' کمپیوٹر سی ڈیز اور ٹی وی چینلز کے ذریعے ذوق وشوق سے دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ آپ کا بیان کردہ مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن (بیان القرآن) کیو ٹی وی' پیس ٹی وی اور دیگر چینلز سے متعدد مرتبہ نشر ہو چکا ہے' لیکن کبھی کسی مذہبی حلقے کی طرف سے اس پر کوئی اعتراض سامنے نہیں آیا۔ کچھ عرصہ سے کیو ٹی وی پر محترم ڈاکٹر صاحب کا سلسلہ وار درس قرآن نشر ہو رہا تھا جو انہوں نے دس بارہ برس قبل قرآن آڈیٹوریم کی ہفتہ وار نشستوں میں دیا تھا۔ اس ضمن میں ۱۲ جون کو کیو ٹی وی پر سورۃ النساء کی آیت ۴۳ کی ریکارڈنگ دکھائی گئی۔

اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ دورِ جاہلیت میں عرب معاشرے میں شراب اس قدر عام تھی کہ گویا یہ عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت میں تدریجی انداز اختیار فرمایا۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا جس میں بعض صحابہ کرامؓ کا ایک دعوتِ طعام میں شرکت کے بعد نمازِ مغرب ادا کرنے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ شراب نوشی کے زیر اثر امام سے سورۃ الکافرون کی قراءت میں غلطی ہو گئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ...... ﴾ (النساء: ۴۳) ''اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ' یہاں تک کہ (نشہ زائل ہو جائے اور) اور جو کچھ تم کہو اس کو سمجھنے لگو......''

یہ حدیث متعدد کتب احادیث میں روایت ہوئی ہے اور اہل سنت کی اکثر تفاسیر میں اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ لیکن کیو ٹی وی پر محترم ڈاکٹر صاحب کے درس میں یہ حدیث نشر ہوتے ہی اہل تشیع کے بعض حلقوں کی طرف سے ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔ لاتعداد فون موصول ہوئے جن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں' ان کے خلاف انتہائی غلیظ زبان استعمال کی گئی۔ انہیں شاتمِ اہل بیت قرار دیا گیا——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں زبان درازی کی گئی۔ بعد

ازاں شہر میں جا بجا جلوس اور ریلیاں بھی نکالی گئیں۔

(اس صورت حال میں جب علماء اہل سنت کی طرف سے ۷ جولائی کو پریس کلب میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس منعقد کی گئی۔ بعدازاں ۲۱ جولائی کو تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر میں علماء اہل سنت کا ایک اجتماع ہوا جس میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے یک جہتی کا اظہار کیا گیا اور ان کے بیان کردہ مباحث کو اہل سنت کے موقف کی ترجمانی قرار دیا گیا۔ علماءِ اہل سنت کے اس اجتماع کے بعد اخبارات کے لیے مندرجہ ذیل پریس ریلیز جاری کیا گیا:

''ڈاکٹر اسرار احمد نے کیوٹی وی پر نشر ہونے والے اپنے درس میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اہل سنت والجماعت کے مؤقف ہی کی ترجمانی ہے۔ اس میں خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی توہین کا معاملہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ بات تنظیم اسلامی کے دفتر میں علمائے اہل سنت کے نمائندہ علماء نے متفقہ طور پر ایک اجتماع میں کہی۔ اس اجتماع میں مولانا عبدالرؤف ملک' حافظ ابتسام الٰہی ظہیر' پیر سیف اللہ خالد' انجینئر سلیم اللہ خان' قاری محمد یوسف احرار' مولانا امیر حمزہ' حافظ صلاح الدین یوسف' مولانا عبدالرؤف فاروقی' مولانا عبدالجلیل نقشبندی' مفتی محمد ہاشم نعیمی' حافظ اسعد عبید' مولانا غلام رسول راشدی' مولانا شمس الرحمٰن معاویہ' مولانا مخدوم منظور احمد' مولانا خلیل الرحمٰن' مولانا میاں عبدالرحمٰن' مولانا مجیب الرحمٰن انقلابی' صاحبزادہ عاصم مخدوم' مولانا عبدالوحید' قاری نذیر احمد' مولانا یونس حسن نے شرکت کی۔ اجلاس میں تنظیم اسلامی کے امیر حافظ عاکف سعید اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد بھی موجود تھے۔ علمائے اہل سنت کے اس نمائندہ اجتماع نے متفقہ قرارداد میں ڈاکٹر اسرار احمد کے علمی مؤقف کی تائید اور ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے کہا کہ یہ اہل سنت کا متفقہ مؤقف ہے۔ اس موقع پر مستقبل میں ایسے مسائل کے حل کے لیے ''مجلس مشاورت علمائے اہل سنت'' کے نام سے ایک مستقل ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تمام شرکاء نے متفقہ طور پر مولانا عبدلرؤف فاروقی کو اس مجلس کا صدر منتخب کیا۔ یہ مجلس مشاورت آئندہ ایسے مسائل پر اہل سنت کا متفقہ علمی مؤقف قوم کے سامنے پیش کر کے اُن کی فکری و نظریاتی رہنمائی کا کردار ادا کرتی رہے گی۔

اجلاس میں کہا گیا کہ ملک کی موجودہ صورت حال نہایت ابتر ہے۔ ملک میں منظّم سازش کے تحت لسانی' علاقائی اور مذہبی منافرت کی آگ بھڑکانے کا کھیل جاری ہے۔ لہٰذا دینی' سیاسی' سماجی محاذ پر یکجہتی اور اتحاد کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے ٹی چینلز پر دروس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ (جاری کردہ: شعبہ نشر و اشاعت تنظیم اسلامی)

''۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۲۷۴ تا ۲۸۱

﴿اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾ یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾﴾

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا جو رکوع پڑھ رہے ہیں یہ آج کے حالات میں اہم ترین ہے۔

یہ رکوع سود کی حرمت اور شناعت پر قرآن حکیم کا انتہائی اہم مقام ہے۔ اِس دَور میں اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کی سب سے بڑی صورت تو غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور ہے‘ جو سب سے بڑا شرک ہے۔ اگرچہ نفسیاتی اور داخلی اعتبار سے سب سے بڑا شرک مادے پر توکل ہے‘ لیکن خارجی اور واقعاتی دنیا میں اس وقت سب سے بڑا شرک غیر اللہ کی حاکمیت ہے‘ جو اَب ’’عوامی حاکمیت‘‘ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کے بعد اس وقت کے گناہوں اور بدعملی میں سب سے بڑا فتنہ اور فساد سود کی بنیاد پر ہے۔ اِس وقت دنیا میں سب سے بڑی شیطنت جو یہودیوں کے ذریعے سے پورے کرۂ ارضی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے تاب ہے‘ وہ یہی سود کا ہتھکنڈا ہے۔ یہاں اس کی حرمت دوٹوک انداز میں بیان کر دی گئی۔ اس مقام پر میرے ذہن میں کبھی کبھی ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق تو انفاق فی سبیل اللہ سے ہے‘ لہٰذا اسے پچھلے رکوع کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا‘ لیکن بعد میں یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ اس آیت کو بڑی حکمت کے ساتھ اس رکوع کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ وہ حکمت مَیں بعد میں بیان کروں گا۔

آیت ۲۷۴ ﴿اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ﴾ ’’جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں رات کو بھی اور دن میں بھی‘‘

﴿سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً﴾ ’’خفیہ طور پر بھی اور علانیہ بھی‘‘

صدقاتِ واجبہ علانیہ اور صدقاتِ نافلہ خفیہ طور پر دیتے ہیں۔

﴿فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴾ ’’اُن کے لیے ان کا اجر (محفوظ) ہے ان کے ربّ کے پاس‘ نہ تو اُن پر کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔‘‘

اس کے برعکس معاملہ ان کا ہے جو سود کھاتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ ہے ’’قدرِ زائد‘‘ (surplus value) کا! آپ کا کوئی شغل ہے‘ کوئی کاروبار ہے یا ملازمت ہے‘ آپ کما رہے ہیں‘ اس سے آپ کا خرچ پورا ہو رہا ہے‘ کچھ بچت بھی ہو رہی ہے۔ اب اس بچت کا اصل مصرف کیا ہے؟ آیت ۲۱۹ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ﴾ ’’لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ کہہ

دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو!'' چنانچہ اصل راستہ تو یہ ہے کہ اپنی بچت کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ یا محتاجوں کو دے دو یا اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور سربلندی میں لگا دو۔ لیکن سود خورانہ ذہنیت یہ ہے کہ اس بچت کو بھی مزید کمائی کا ذریعہ بناؤ۔ لہٰذا اصل میں سود خوری انفاق فی سبیل اللہ کی ضد ہے۔ یہ عقدہ مجھ پر اُس وقت کھلا جب میں نے ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اصول کے تحت سورۃ الروم کی آیت ۳۹ کا مطالعہ کیا۔ وہاں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لایا گیا ہے' اللہ کی رضا جوئی کے لیے انفاق اور اس کے مقابلے میں ربا' یعنی سود پر رقم دینا۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''اور جو مال تم دیتے ہو سود پر تا کہ لوگوں کے اموال میں (شامل ہو کر) بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا''۔ محنت کوئی کر رہا ہے اور آپ اس کی کمائی میں سے اپنے سرمائے کی وجہ سے وصول کر رہے ہیں تو آپ کا مال اس کے مال میں شامل ہو کر اس کی محنت سے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ ﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ ''اور وہ جو تم زکوٰۃ (اور صدقات) میں دے دیتے ہو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ (اپنے مال اللہ کے ہاں) بڑھا رہے ہیں''۔ ان کا مال مسلسل بڑھ رہا ہے' اس کی بڑھوتری ہو رہی ہے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کا معاملہ سود کے بالمقابل اور اس کے برعکس ہے۔ اپنے اس بچت کے مال کو یا تو کوئی اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا یا پھر سودی منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ آج کے بینکنگ کے نظام میں سب سے زیادہ زور بچت (saving) پر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے سیونگ اکاؤنٹ اور بہت سی پرکشش منافع بخش سکیمیں متعارف کرائی جاتی ہیں۔ ان کی طرف سے یہی ترغیب دی جاتی ہے کہ بچت کرو مزید کمانے کے لیے! بچت اس لیے نہیں کہ اپنا پیٹ کاٹو اور غرباء کی ضروریات پوری کرو' اپنا معیارِ زندگی کم کرو اور اللہ کے دین کے لیے خرچ کرو۔ نہیں' بلکہ اس لیے کہ جو کچھ تم بچاؤ وہ ہمیں دو' تا کہ وہ ہم زیادہ شرح سود پر دوسروں کو دیں اور تھوڑی شرح سود تمہیں دے دیں۔ چنانچہ انفاق اور سود ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فرمایا:

آیت ۲۷۵ ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ ''جو لوگ سود کھاتے ہیں۔''

﴿لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ ''وہ نہیں

کھڑے ہوتے مگر اُس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔''

یہاں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ قیامت کے دن کا نقشہ ہے۔ قیامت کے دن کا یہ نقشہ تو ہوگا ہی' اس دنیا میں بھی سود خوروں کا حال یہی ہوتا ہے' اور ان کا یہ نقشہ کسی سٹاک ایکسچینج میں جا کر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوگا گویا دیوانے ہیں' پاگل ہیں' جو چیخ رہے ہیں' دوڑ رہے ہیں' بھاگ رہے ہیں۔ وہ نارمل انسان نظر نہیں آتے' مخبوط الحواس لوگ نظر آتے ہیں جن پر گویا آسیب کا سایہ ہو۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ ''اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔''

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے سو روپے کا مال خریدا' ۱۱۰ روپے میں بیچ دیا' دس روپے بچ گئے' یہ ربح (منافع) ہے' جو جائز ہے' لیکن اگر سو روپے کسی کو دیے اور ۱۱۰ واپس لیے تو یہ ربا (سود) ہے' یہ حرام کیوں ہو گیا؟ ایک شخص نے دس لاکھ کا مکان بنایا' چار ہزار روپے ماہانہ کرایے پر دے دیا تو جائز ہو گیا' اور دس لاکھ روپے کسی کو قرض دیے اور اُس سے چار ہزار روپے مہینہ لینا شروع کیے تو یہ سود ہو گیا' حرام ہو گیا' ایسا کیوں ہے؟ عقلی طور پر اس طرح کی باتیں سود کے حامیوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں۔ (ربح اور ربا کا فرق سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔) اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے یہ مخبوط الحواس سود خور لوگ ان دونوں کے اندر کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا عقلی جواب نہیں دیا' بلکہ فرمایا:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

اب تم یہ بات کرو کہ اللہ کو مانتے ہو یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہو یا نہیں؟ قرآن کو مانتے ہو یا نہیں؟ یا محض اپنی عقل کو مانتے ہو؟ اگر تم مسلمان ہو' مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر سر تسلیم خم کرو۔ ﴿وَمَا اٰتٰىکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰىکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾ (الحشر: ۷) ''جو کچھ رسولؐ تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ''۔ یہ تو شریعت کا معاملہ ہے۔ ویسے معاشیات کے اعتبار سے اس میں یہ فرق واقع ہوتا ہے کہ ایک ہے fluid capital اور ایک ہے fixed capital۔ جہاں تک

مکان کا معاملہ ہے تو وہ fixed capital ہے۔ دس لاکھ روپے کے مکان میں جو شخص رہ رہا ہے وہ اس سے کیا فائدہ اٹھائے گا؟ وہ اس میں رہائش اختیار کرے گا اور اس کے عوض ماہانہ کرایہ ادا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ نے دس لاکھ روپے کسی کو نقد دے دیے تو وہ انہیں کسی کام میں لگائے گا۔ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ دس لاکھ کے بارہ لاکھ یا پندرہ لاکھ بن جائیں اور یہ بھی کہ آٹھ لاکھ رہ جائیں۔ چنانچہ اس صورت میں اگر آپ نے پہلے سے طے شدہ (fix) منافع وصول کیا تو یہ حرام ہو جائے گا۔ تو ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عقلی جواب نہیں دیا۔ جواب دیا کہ ''اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربا کو حرام''۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ ''تو جس شخص کے پاس اس کے ربّ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہے۔''

وہ اُس سے واپس نہیں لیا جائے گا۔ حساب کتاب نہیں کیا جائے گا کہ تم اتنا سود کھا چکے ہو' واپس کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

﴿وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور چاہے گا تو پچھلے سود پر بھی سرزنش ہوگی۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ ''اور جس نے (اس نصیحت کے آ جانے کے بعد بھی) دوبارہ یہ حرکت کی تو یہ لوگ جہنمی ہیں' وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیت ۲۷۶ ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ﴾ ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''

ہمارے زمانے میں شیخ محمود احمد (مرحوم) نے اپنی کتاب ''Man & Money'' میں ثابت کیا ہے کہ تین چیزیں سود کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ جتنا سود بڑھے گا اسی قدر بے روزگاری بڑھے گی' افراطِ زر (inflation) میں اضافہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں شرح سود (interest rate) بڑھے گا۔ شرح سود کے بڑھنے سے بے روزگاری مزید بڑھے گی اور افراطِ زر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ یہ ایک دائرۂ خبیثہ (viscious circle) ہے اور اس کے نتیجے

میں کسی ملک کی معیشت بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ تباہی ایک وقت تک پوشیدہ رہتی ہے' لیکن پھر یک دم اس کا ظہور بڑے بڑے بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ابھی جو کوریا کا حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سے پہلے روس کا جو حشر ہو چکا ہے وہ پوری دنیا کے لیے باعث عبرت ہے۔ سودی معیشت کا معاملہ تو گویا شیش محل کی طرح ہے' اس میں تو ایک پتھر آ کر لگے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس معاملہ صدقات کا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ پالتا ہے' بڑھاتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں ارشاد ہوا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ ''اور اللہ کسی ناشکرے اور گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو وہ سب لوگ ہرگز پسند نہیں ہیں جو ناشکرے اور گناہگار ہیں۔

آیت ۲۷۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ''ہاں جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے ان کے لیے ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔''

نیک عمل میں ظاہر بات ہے جو شے حرام ہے اس کا چھوڑ دینا بھی لازم ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ ''اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

آیت ۲۷۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو''

آج فیصلہ کر لو کہ جو کچھ بھی تم نے کسی کو قرض دیا تھا اب اس کا سود چھوڑ دینا ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ''اگر تم واقعی مؤمن ہو۔''

آیت ۲۷۹ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''

سود خوری سے باز نہ آنے پر یہ الٹی میٹم ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی اور گناہ پر یہ بات نہیں

آئی ہے۔ یہ واحد گناہ ہے جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ ''اور اگر تم توبہ کر لو تو پھر اصل اموال تمہارے ہی ہیں۔''

تمہارے جو اصل رأس المال ہیں وہ تمہیں لوٹا دیے جائیں گے۔ چنانچہ سود چھوڑ دو اور اپنے رأس المال واپس لے لو۔

﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ ''نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

نہ تم کسی پر ظلم کرو کہ اس سے سود وصول کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے کہ تمہارا رأس المال بھی دبا دیا جائے۔

آیت ۲۸۰ ﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ ''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی حاصل ہونے تک اسے مہلت دو۔''

اسے مہلت دو کہ اس کے ہاں کشادگی پیدا ہو جائے تاکہ وہ آسانی سے آپ کا قرض آپ کو واپس کر سکے۔

﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''اور اگر تم صدقہ ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''

تمہارا بھائی غریب تھا' اس کو تم نے قرض دیا تھا' اس پر کچھ سود لے کر کھا بھی چکے ہو' باقی سود کو تو چھوڑا ہی ہے' اگر اپنا رأس المال بھی اس کو بخش دو تو یہ انفاق ہو جائے گا' یہ اللہ کو قرضِ حسنہ ہو جائے گا اور تمہارے لیے ذخیرۂ آخرت بن جائے گا۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ آپ کی جو بچت ہے' جسے میں نے قدرِ زائد (surplus value) کہا تھا' اسلامی معیشت کے اندر اُس کا سب سے اونچا مصرف انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو' صدقہ کر دو۔ اس سے کم تر ''قرضِ حسنہ'' ہے۔ آپ کے کسی بھائی کا کاروبار رُک گیا ہے' اس کو قرض دے دو' اس کا کاروبار چل پڑے گا اور پھر وہ تمہیں تمہاری اصل رقم واپس کر دے گا۔ یہ قرضِ حسنہ ہے' اس کا درجہ انفاق سے کم تر ہے۔ تیسرا درجہ مضاربت کا ہے' جو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر تم زیادہ ہی خسیس ہو تو چلو اپنا سرمایہ اپنے کسی بھائی کو مضاربت پر دے دو۔ اور مضاربت یہ ہے کہ رقم تمہاری ہو گی اور کام وہ کرے گا۔ اگر بچت ہو جائے تو اس میں تمہارا بھی حصہ ہو گا' لیکن اگر نقصان ہو جائے تو وہ کل کا کل تمہارا ہو گا' تم اس سے کوئی تاوان نہیں لے سکتے۔ اس

کے بعد ان تین درجوں سے بھی نیچے اتر کر اگر تم کہو کہ میں یہ رقم تمہیں دے رہا ہوں' اس پر اتنے فیصد منافع تو تم نے بہر حال دینا ہی دینا ہے' تو اس سے بڑھ کر حرام شے کوئی نہیں ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارا مقروض تنگی میں ہے تو پھر انتظار کرو' اُسے اس کی کشائش اور فراخی تک مہلت دے دو۔ اور اگر تم صدقہ ہی کر دو' خیرات کر دو' بخش دو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴿۲۸۰﴾﴾ ''اگر تم جانتے ہو۔''

اگر تمہیں اللہ نے حکمت عطا کر دی ہے' اگر تم اولوالالباب ہو' اگر تم سمجھ دار ہو تو تم اُس بچت کے امیدوار بنو جو اللہ کے ہاں اجر و ثواب کی صورت میں تمہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں اس رقم کی کوئی حیثیت نہیں جو تمہیں مقروض سے واپس ملنی ہے۔

اگلی آیت نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری آیت ہے۔

آیت ۲۸۱ ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ‌ۖ﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن تم لوٹا دیے جاؤ گے اللہ کی طرف۔''

یہاں وہ آیت یاد کیجیے جو سورۃ البقرۃ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ دو بار آ چکی ہے: ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی''۔ اور ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی''۔

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ﴾ ''پھر ہر جان کو پورا پورا دے دیا جائے گا جو کمائی اس نے کی ہوگی۔''

﴿وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ﴿۲۸۱﴾﴾ ''اور اُن پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔''

آیات ۲۸۲، ۲۸۳

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا ؕ فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِکُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی ؕ وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَکْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا اِلٰٓی اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓی اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَکُمْ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِکُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ کُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا کَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ یَّکْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۳﴾﴾

آیت ۲۸۲، جو زیر مطالعہ ہے، قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے اور اسے ''آیتِ دَین'' یا ''آیت مُدَایَنَہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی قرض کا باہم لین دین ہو یا آپس میں کاروباری معاملہ ہو تو اسے باقاعدہ طور پر لکھ لیا جائے اور اس پر دو گواہ مقرر کیے جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس قرآنی ہدایت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور کسی بھائی، دوست یا عزیز کو قرض دیتے ہوئے یا کوئی کاروباری معاملہ کرتے ہوئے یہ خیال کیا جاتا

ہے کہ اس سے کیا لکھوانا ہے' وہ کہے گا کہ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ تمام معاملات زبانی طے کر لیے جاتے ہیں' اور بعد میں جب معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو پھر لوگ شکوہ و شکایت اور چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں قرآنی ہدایات کے مطابق مالی معاملات کو تحریر کر لیا جائے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچے گی۔ حدیث نبویؐ کا مفہوم ہے کہ جو شخص قرض دیتے ہوئے یا کوئی مالی معاملہ کرتے ہوئے لکھواتا نہیں ہے' اگر اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے تو اسے اس پر کوئی اجر نہیں ملتا' اور اگر وہ مقروض کے حق میں بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی فریاد نہیں سنتا' کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

آیت ۲۸۲ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ﴾ ''اے اہل ایمان! جب بھی تم قرض کا کوئی معاملہ کرو ایک وقت معین تک کے لیے تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

آیت کے اس ٹکڑے سے دو حکم معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرض کا وقت معین ہونا چاہیے کہ یہ کب واپس ہوگا اور دوسرے یہ کہ اسے لکھ لیا جائے۔ **فَاكْتُبُوْهُ** فعل امر ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

﴿وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ ''اور چاہیے کہ اس کو لکھے کوئی لکھنے والا تمہارے مابین عدل کے ساتھ۔''

لکھنے والا کوئی ڈنڈی نہ مار جائے' اسے چاہیے کہ وہ صحیح صحیح لکھے۔

﴿وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ﴾ ''اور جو لکھنا جانتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے' جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا ہے' پس چاہیے کہ وہ لکھ دے۔''

یہ ہدایت تاکید کے ساتھ کی گئی' اس لیے کہ اس معاشرے میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے۔ اب بھی مالی معاملات اور معاہدات بالعموم وثیقہ نویس تحریر کرتے ہیں۔

﴿وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ﴾ ''اور املاء وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے''

یعنی جس نے قرض لیا ہے وہ دستاویز لکھوائے کہ میں کیا ذمہ داری لے رہا ہوں' جس کا مال ہے وہ نہ لکھوائے۔

﴿وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ''اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے اپنے ربّ سے''

﴿وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ﴾ ''اور (لکھواتے ہوئے) اس میں سے کوئی شے کم نہ کر دے۔''

﴿فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا﴾ ''پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے' ناسمجھ یا ضعیف ہو''

﴿اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ﴾ ''یا اس کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہو کہ اِملاء کروا سکے''

﴿فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ﴾ ''تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔''
اگر قرض لینے والا ناسمجھ ہو' ضعیف ہو یا دستاویز نہ لکھوا سکتا ہو تو اُس کا کوئی ولی' کوئی وکیل یا مختار (attorney) اُس کی طرف سے انصاف کے ساتھ دستاویز تحریر کرائے۔ یہاں ''اِملال'' اِملاء کے معنی میں آیا ہے۔

﴿وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۚ﴾ ''اور اس پر گواہ بنا لیا کرو اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو۔''

﴿فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ﴾ ''پھر اگر دو مرد دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں''

﴿مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ ''یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں''
جن کی گواہی ہر دو فریق کے نزدیک مقبول ہو اور ان پر دونوں کو اعتماد ہو۔ اگر مذکورہ صفات کے دو مرد دستیاب نہ ہو سکیں تو گواہی کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کر لیا جائے۔ یعنی گواہوں میں ایک مرد کا ہونا لازم ہے' محض عورت کی گواہی نہیں چلے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر قسم کے معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا یہ معاملہ صرف قرض اور مالی معاملات میں دستاویز تحریر کرتے وقت کا ہے' اس کی تفصیل فقہاء کے ہاں ملتی ہے۔

﴿اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ﴾ ''تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد کروا دے۔''
یہاں عقلی سوال پیدا ہو گیا کہ کیا مرد نہیں بھول سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر نسیان کا مادّہ زیادہ رکھا ہے۔ ﴿اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ

الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾ (الملك) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ بڑا باریک بین اور ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔'' جس نے پیدا کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس میں کون سا مادّہ زیادہ ہے۔ عورت میں نسیان کا مادّہ کیوں زیادہ رکھا گیا ہے' یہ بھی سمجھ لیجیے۔ یہ بڑی عقلی اور منطقی بات ہے۔ دراصل عورت کو مَرد کے تابع رہنا ہوتا ہے' لہٰذا اُس کے احساسات کو کبھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے' اُس کے جذبات کے اوپر کبھی کوئی کدورت آتی ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بھول جانے کا مادہ ''سیفٹی والو'' کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تو ان کا معاملہ اس شعر کے مصداق ہو جائے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے اب مجھ سے حافظہ میرا!

چنانچہ یہ نسیان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے' ورنہ تو کوئی صدمہ دل سے اترنے ہی نہ پائے' کوئی غصہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ بہرحال خواہ کسی حکم کی علت یا حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اللہ کا حکم تو بہرصورت ماننا ہے۔

﴿وَلَا یَاۡبَ الشُّہَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ﴾ ''اور نہ انکار کریں گواہ جبکہ ان کو بلایا جائے۔''

گواہوں کو جب گواہی کے لیے بلایا جائے تو آ کر گواہی دیں' اس سے انکار نہ کریں۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۴۰ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک شہادت موجود ہو اور وہ اسے چھپائے؟''

﴿وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَکۡتُبُوۡہُ صَغِیۡرًا اَوۡ کَبِیۡرًا اِلٰۤی اَجَلِہٖ﴾ ''اور تساہل مت کرو اس کے لکھنے میں' معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی معین مدت کے لیے۔''

قرض خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی دستاویز تحریر ہونی چاہیے کہ میں اتنی رقم لے رہا ہوں اور اتنے وقت میں اسے لوٹا دوں گا۔ اس کے بعد قرض خواہ اس مدت کو بڑھا بھی سکتا ہے' مزید مہلت دے سکتا ہے' بلکہ معاف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن قرض دیتے وقت اس کی مدت معین ہونی چاہیے۔

﴿ذٰلِکُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰہِ﴾ ''یہ اللہ کے نزدیک بھی زیادہ مبنی بر انصاف ہے''

﴿وَاَقۡوَمُ لِلشَّہَادَۃِ﴾ ''اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے''

معاملہ ضبطِ تحریر میں آ جائے گا تو بہت واضح رہے گا' ورنہ زبانی یادداشت کے اندر تو کہیں تعبیر ہی میں فرق ہو جاتا ہے۔

﴿وَاَدۡنٰۤی اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا﴾ ''اور یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے''
﴿اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً تُدِیۡرُوۡنَہَا بَیۡنَکُمۡ﴾ ''الّا یہ کہ کوئی تجارتی لین دین ہو جو تم دست بدست کرتے ہو''

مثلاً آپ کسی دکاندار سے کوئی شے خریدتے ہیں اور نقد پیسے ادا کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ اس کا کیش میمو بھی لیں۔ اگر آپ چاہیں تو دکاندار سے کیش میمو طلب کر سکتے ہیں۔

﴿فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَکۡتُبُوۡہَا﴾ ''تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اسے نہ لکھو''

﴿وَاَشۡہِدُوۡۤا اِذَا تَبَایَعۡتُمۡ﴾ ''اور گواہ بنالیا کرو جب کوئی (مستقبل کا) سودا کرو''

''بیع سَلَم'' جو ہوتی ہے یہ مستقبل کا سودا ہے' اور یہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی زمیندار سے طے کرتے ہیں کہ آئندہ فصل کے موقع پر آپ اس سے اتنے روپے فی من کے حساب سے پانچ سو من گندم خریدیں گے۔ یہ بیع سَلَم کہلاتی ہے اور اس میں لازم ہے کہ آپ پوری قیمت ابھی ادا کر دیں اور آپ کو گندم فصل کے موقع پر ملے گی۔ اس طرح کا لین دین بھی باقاعدہ تحریر میں آجانا چاہیے اور اس پر دو گواہ مقرر ہونے چاہئیں۔

﴿وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَہِیۡدٌ ؕ﴾ ''اور نہ نقصان پہنچایا جائے کسی لکھنے والے کو اور گواہ کو۔ اور نہ نقصان پہنچائے کوئی لکھنے والا اور گواہ۔''

''یُضَآرَّ'' میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں۔ اس لیے کہ یہ معروف بھی ہے اور مجہول بھی۔

﴿وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّہٗ فُسُوۡقٌۢ بِکُمۡ ؕ﴾ ''اور اگر تم ایسا کرو گے (نقصان پہنچاؤ گے) تو یہ تمہارے حق میں گناہ کی بات ہوگی۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

﴿وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ؕ﴾ ''اور اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے۔''

﴿وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۸۲﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یہ ایک آیت مکمل ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آخری پارے کی چار پانچ چھوٹی سورتیں جمع کر لیں تو ان کا حجم اس ایک آیت کے برابر ہوگا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آیات کی تعیین تو قیفی ہے۔ اس کا ہمارے حساب کتاب سے' گرامر سے' منطق سے اور علمِ بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت ۲۸۳ ﴿وَاِنۡ کُنۡتُمۡ عَلٰی سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا کَاتِبًا﴾ ''اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی

لکھنے والا نہ پاؤ‘‘

اگر دورانِ سفر کوئی لین دین کا یا قرض کا معاملہ ہو جائے اور کوئی کاتب نہ مل سکے۔

﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ ’’تو کوئی شے گروی رکھ لو قبضے میں۔‘‘

قرض لینے والا اپنی کوئی شے قرض دینے والے کے حوالے کر دے کہ میری یہ شے آپ کے قبضے میں رہے گی‘ آپ اتنے پیسے مجھے دے دیجیے‘ میں جب یہ واپس کر دوں گا آپ میری چیز مجھے لوٹا دیجیے گا۔ یہ رہن بالقبضہ ہے۔ لیکن رہن (گروی) رکھی ہوئی چیز سے کوئی فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے‘ وہ سود ہو جائے گا۔ مثلاً اگر مکان رہن رکھا گیا ہے تو اس پر قبضہ تو قرض دینے والا کا ہو گا‘ لیکن وہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا‘ اس کا کرایہ نہیں لے سکتا‘ کرایہ مالک کو جائے گا۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ’’پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے‘‘

یعنی ایک شخص دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے بغیر رہن کے اسے قرض دے دیتا ہے۔

﴿ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ ’’تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اُس کو چاہیے کہ وہ اس کی امانت واپس کرے‘‘

ایک شخص کے پاس رہن دینے کو کچھ نہیں تھا یا یہ کہ دوسرے بھائی نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اُس سے کوئی شے رہن نہیں لی اور اس کو قرض دے دیا تو یہ مال جو اُس نے قرض لیا ہے یہ اس کے پاس قرض دینے والے کی امانت ہے‘ جس کا واپس لوٹانا اس کے ذمے فرض ہے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ’’اور اللہ سے ڈرے جو اس کا ربّ ہے۔‘‘

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ ’’اور گواہی کو چھپایا نہ کرو۔‘‘

﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ ’’اور جو کوئی گواہی کو چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہو گا۔‘‘

بعض گناہوں کا اثر انسان کے ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے‘ جبکہ بعض کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ شہادت کا چھپانا بھی اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اور اگر کسی کا دل داغ دار ہو گیا تو باقی کیا رہ گیا؟

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔‘‘

❁❁❁

حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۶ جولائی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ، درود شریف اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا:

گزشتہ پانچ نشستوں میں ''حدیث جبریلؑ'' کا مطالعہ مکمل کر لینے کے بعد ترتیب کے اعتبار سے تو ہمیں آج کی نشست میں اربعینِ نوویؒ کی تیسری حدیث کا مطالعہ کرنا تھا، لیکن میں نے اس مجموعے میں حضرت معاذ بن جبل ؓ سے مروی جس حدیث (حدیث نمبر ۴۳) کا اضافہ کیا ہے، آج آپ کو پہلے اس کا مطالعہ کرا رہا ہوں۔ اس لیے کہ حدیث جبریلؑ کے ساتھ اس حدیث کو بہت زیادہ مشابہت حاصل ہے۔ ایک تو اِس کے مشمولات (contents) کے اعتبار سے مشابہت ہے کہ دین کی حکمت کیا ہے، دین بحیثیت کل کیا ہے، اس کے اجزاء کیا ہیں اور اس کے مراحل و مراتب اور منازل کیا ہیں۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ میرے نزدیک بعض اعتبارات سے حدیث جبریلؑ سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ دوسرے یہ حدیث جبریلؑ کے contents کے علاوہ اس کے اسلوب سے بھی مشابہت رکھتی ہے۔ حدیث جبرئیلؑ میں رسول اللہ ﷺ کی محفل کا ایک واقعہ ایسی تفصیلات کے ساتھ اور اِس انداز میں بیان ہوا کہ گویا ہماری نگاہوں کے سامنے وہ نقشہ آ گیا، اور تھوڑی دیر کے لیے ہمیں یہ لذت محسوس ہوئی کہ ہم خود بھی اسی ماحول اور اسی مجلس کا حصہ ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کے واقعاتی انداز اور پس منظر کے بیان میں

اس سے بھی کہیں بڑھ کر کیفیت حاصل ہو رہی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مابین ایک اور مشابہت بھی ہے' اور وہ یہ کہ یہ دونوں حدیثیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری دَور کی ہیں۔ آج کی نشست میں ہم اس حدیث کے ترجمے اور چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں' جبکہ اس کے اندر جو دو اہم مضامین بیان ہوئے ہیں اُن پر تفصیلی گفتگو اِن شاء اللہ آئندہ ہوگی۔

اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی شخصیت کا اجمالی تعارف یہ ہے کہ آپؓ ایک انصاری صحابی ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا ایک بہت اونچا مقام ہے۔ آنحضور ﷺ نے اپنے بعض صحابہؓ کے لیے مدح کے الفاظ افعل التفضیل کے صیغے میں ارشاد فرمائے ہیں' ان میں ایک نام حضرت معاذ بن جبلؓ کا بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ' وَاَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ' وَاَصْدَقُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ' وَاَقْضَاھُمْ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ ..... وَاَعْلَمُھُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ.....))(۱)

''میری اُمت میں سے ان کے حق میں سب سے زیادہ رحیم و شفیق ابوبکرؓ ہیں' اللہ کے (دین کے) معاملے میں ان میں سب سے زیادہ سخت اور شدید عمرؓ ہیں' ان میں سب سے زیادہ باحیا انسان عثمانؓ ہیں' سب سے زیادہ صائب الرائے (صحیح فیصلے تک پہنچنے والے) علیؓ بن ابی طالب ہیں..... اور ان میں حلال اور حرام کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبلؓ ہیں.....''

درحقیقت ان کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو اُس وقت ان کا آپ ﷺ کے ساتھ جو مکالمہ ہوا تھا وہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ بہرحال میں نے اُن کی شخصیت کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے تاکہ آپ کے سامنے یہ عظیم حقیقت واضح ہو جائے کہ اتنی بلند پایہ شخصیت کو کیا چیز مسلسل پریشان کر رہی تھی'

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت و ابی بن کعب۔ و سنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب فضائل خباب۔

جس کے بارے میں اس حدیث میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا' اور اس کے برعکس ہماری پریشانی کا سبب کون سی چیزیں ہیں۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ بِالنَّاسِ قَبْلَ غَزْوَةِ تَبُوْکَ

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ غزوۂ تبوک سے قبل لوگوں کو لے کر نکلے۔'' یعنی تبوک کی طرف جاتے ہوئے سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا۔ **فَلَمَّا اَنْ اَصْبَحَ** ''تو جب صبح ہوگئی'' (یعنی فجر طلوع ہوگئی)۔ اس جملے کے پیچھے یہ چیز پوشیدہ ہے کہ اس طرح کا سفر رات کے وقت کیا جاتا تھا' اس لیے کہ دن میں صحرا کا سفر شدید گرمی اور دھوپ کی تمازت کی وجہ سے تقریباً ناممکن تھا۔ جبکہ رات کے وقت چونکہ دھوپ نہیں ہوتی تھی' بلکہ خنکی ہوتی تھی' لہٰذا جتنا بھی فاصلہ رات کو طے ہو جاتا تھا وہ غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ تبوک کا سفر بھی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رات کو ہی کیا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آگے فرما رہے ہیں: **صَلّٰی بِالنَّاسِ صَلَاةَ الصُّبْحِ** ''تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی''۔ یعنی آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو فجر کی نماز پڑھائی۔ **ثُمَّ اِنَّ النَّاسَ رَکِبُوْا** ''پھر لوگ دوبارہ سوار ہو گئے۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی چونکہ سورج کے نکلنے اور دھوپ کے تیز ہونے میں کچھ وقت باقی تھا' موسم ابھی ٹھنڈا تھا' لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اس ٹھنڈے موسم میں جتنا سفر طے ہو جائے وہ غنیمت ہے' جبکہ تمازت زیادہ ہو جانے کی صورت میں سفر ممکن نہیں رہے گا اور سورج ڈھلنے تک کہیں نہ کہیں آرام کرنا پڑے گا۔

فَلَمَّا اَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ نَعَسَ النَّاسُ فِیْ اَثَرِ الدُّلْجَةِ 'تو جب سورج طلوع ہو گیا تو لوگ شب بیداری کے اثرات کے تحت اونگھنے لگے۔'' ہر شخص کو اِس کیفیت کا تجربہ ہے کہ صبح کے وقت جو نسیم سحر چلتی ہے وہ تو گویا باقاعدہ تھپکیاں دے دے کر سلاتی ہے' اور اگر رات جاگ کر گزاری ہو تو نیند کا غلبہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کو یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے اس طبعی تقاضے کا مقابلہ کرتے ہوئے مسجد میں فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مصلے پر بیٹھا اللہ کا ذکر کرتا رہے اور جب سورج پوری

طرح طلوع ہو جائے تو دو رکعت نماز ادا کرے اور پھر اپنے گھر جائے۔ اس کی بہت زیادہ فضیلت بتائی گئی ہے۔ وَلَزِمَ مُعَاذٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتْلُوْ اَثَرَهٗ ''اور حضرت معاذؓ نے اپنے لیے لازم ٹھہرا لیا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے کو''۔ آپ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے آپؐ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ آپؐ ان سے کہیں الگ نہ ہو جائیں۔ وَالنَّاسُ تَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ عَلٰى جَوَادِ الطَّرِيْقِ ''اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہو گیا کہ ان کی سواریاں انہیں لے کر راستے کی پوری چوڑائی میں پھیل گئیں''۔ راستے کی کوئی حدود تو متعین نہیں تھیں کہ دونوں اطراف میں کوئی باڑ لگی ہو اور بس ان کے اندر ہی سواریوں نے چلنا ہو۔ بلکہ یہ صحرا کا نقشہ ہے۔ اِدھر اُدھر پہاڑ ہیں اور درمیان میں کشادہ وادی ہے جس کے اندر اونٹنیاں اپنے سواروں کو لے کر آزادانہ چل رہی ہیں اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئی ہیں۔ تَاْكُلُ وَتَسِيْرُ ''وہ اونٹنیاں کچھ کھاتی بھی ہیں اور کچھ چلتی بھی ہیں''۔ زمین پر کوئی چارہ ہے تو وہ کھا رہی ہیں یا کوئی کیکر وغیرہ کا درخت ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مقصد کے لیے لمبی گردن دے رکھی ہے، وہ ان درختوں کے پتے اور کانٹے کھا رہی ہیں۔ اور سوار چونکہ اونگھ رہے ہیں، ان کا اونٹنیوں پر کنٹرول تو ہے نہیں لہٰذا ان کو آزادی حاصل ہے۔

فَبَيْنَمَا مُعَاذٌ عَلٰى اَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ''پس اسی دوران میں کہ حضرت معاذؓ اللہ کے رسول ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کر رہے تھے''۔ اپنی اونٹنی کو آپ ﷺ کی اونٹنی کے قریب رکھ رہے تھے۔ وَنَاقَتُهٗ تَاْكُلُ مَرَّةً وَتَسِيْرُ اُخْرٰى ''جبکہ ان کی اونٹنی کبھی کچھ کھانے لگ جاتی اور کبھی چلنے لگ جاتی''۔ یعنی کبھی رک کر کہیں کچھ چر چگ لیتی اور پھر چل پڑتی۔ عَثَرَتْ نَاقَةُ مُعَاذٍ ''اچانک حضرت معاذؓ کی اونٹنی نے (کسی چیز سے) ٹھوکر کھائی''۔ فَكَبَحَهَا بِالزِّمَامِ فَهَبَّتْ ''پس انہوں نے اس کی لگام کھینچی (اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی) تو وہ بدک گئی''۔ حَتّٰى نَفَرَتْ مِنْهَا نَاقَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ''یہاں تک کہ اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی''۔ چونکہ دونوں اونٹنیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں تو جب حضرت معاذ کی اونٹنی بدکی تو آپ ﷺ کی اونٹنی

بھی بدک گئی۔ ثُمَّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَشَفَ عَنْہُ قِنَاعَہٗ ''اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر سے پردہ ہٹایا''۔اونٹنی کے اُوپر ہودج کسا ہوا تھا جس کے اندر آپ ﷺ استراحت فرما رہے تھے۔لیکن جب آپ کی اونٹنی بدکی تو آپؐ نے اپنے ہودج کا پردہ ہٹایا۔فَالْتَفَتَ فَاِذَا لَیْسَ مِنَ الْجَیْشِ رَجُلٌ اَدْنٰی اِلَیْہِ مِنْ مُعَاذٍ تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ پورے لشکر میں سے حضرت معاذؓ سے زیادہ کوئی بھی آپ ﷺ سے قریب نہیں ہے''۔ پورا لشکر منتشر ہو گیا تھا۔سواریاں اپنے سواروں کو لے کر تمام راستے کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ معاذ قریب ہیں۔فَنَادَاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: ((یَا مُعَاذُ)) ''تو آپ ﷺ نے انہیں پکار کر ارشاد فرمایا: اے معاذ!''قَالَ لَبَّیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں حاضر ہوں''۔ قَالَ: ((اُدْنُ دُوْنَکَ)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: اور قریب آ جاؤ''۔فَدَنَا مِنْہُ ''تو حضرت معاذؓ (اپنی اونٹنی کو لے کر) آپؐ کے اور قریب ہو گئے''۔ حَتّٰی لَصِقَتْ رَاحِلَتُھُمَا اِحْدَاھُمَا بِالْاُخْرٰی ''یہاں تک کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسری کے ساتھ مَس کرنے لگیں''۔ یعنی حضور ﷺ کی اونٹنی اور حضرت معاذؓ کی اونٹنی ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا رہی تھیں۔فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((مَا کُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا کَمَکَانِھِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے تو یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگ ہم سے اتنے فاصلے پر ہوں گے!''

اس جملے کے پیچھے ایک حقیقت مخفی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی مسلمانوں کے مابین ایک خاص حیثیت ہے۔آپؐ اللہ کے نبی و رسول ہیں' مسلمانوں کے سپہ سالار ہیں۔ آپؐ کو اکیلا چھوڑ دینا حکمت اور مصلحت کے سراسر خلاف تھا۔ ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ پہرا ہونا چاہیے تھا' تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ سکے۔اور اسی سفر سے واپسی پر ایسا ایک واقعہ پیش آیا بھی ہے۔تبوک سے واپسی پر ایک روز عین دوپہر کے وقت' جبکہ دھوپ تیز ہو گئی تھی' سارا لشکر اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گیا۔ جسے جہاں کوئی سایہ نظر آیا وہ وہاں چلا گیا' تاکہ قیلولہ کر لے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ایک درخت کے سائے میں استراحت

فرمانے لگے اور اپنی تلوار اُس درخت کی ٹہنی کے ساتھ لٹکا دی۔ آپ ﷺ لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اتنے میں ایک کافر کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور آپ ﷺ ہی کی تلوار نیام سے نکال لی۔ آپ ﷺ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ کافر تلوار سونتے سر پر کھڑا ہے۔ اُس نے کہا: اے محمدؐ! اب مجھے بتاؤ تمہیں کون مجھ سے بچا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَللّٰہُ)) ''مجھے اللہ تعالیٰ بچا سکتا ہے''۔ یعنی اگرچہ حالات میرے لیے بالکل ناموافق ہیں' میں لیٹا ہوا ہوں اور تم کھڑے ہو' میں غیر مسلح ہوں جبکہ تمہارے ہاتھ میں تلوار ہے۔ بظاہر حالات و واقعات اور مادی اسباب سارے تمہارے ہاتھ میں ہیں' لیکن اصل مسبب الاسباب تو اللہ ہے۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اللّٰہ کا لفظ ایسے نکلا کہ اس کافر پر کپکپی طاری ہوگئی اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ آپ ﷺ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: ''اب تم بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا: کَرِیْمٌ وَابْنُ کَرِیْمٍ ''آپ تو ایک نہایت شریف انسان ہیں اور ایک نہایت شریف انسان کے بیٹے ہیں''۔ یہ گویا انتہائی خوشامد کے کلمات تھے جو اُس کافر اور مشرک نے کہے۔ کَرِیْم کا لفظ عربی زبان میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت ہی صاحبِ مروّت' صاحبِ شرافت اور بہت ہی سخی شخص۔ اسی سے پھر افعل التفضیل کا صیغہ ہے اَکْرَم۔ اسی لیے ہم آنحضور ﷺ کو ''نبی اکرم'' بھی کہتے ہیں۔ بہرحال آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تم جاؤ' لیکن ایک وعدہ کرو کہ مسلمانوں کے خلاف کبھی جنگ میں شریک نہیں ہوگے۔ آپ ﷺ نے اسے یہ نہیں کہا کہ ایمان لاؤ' کیونکہ یہ تو ایک جبری ایمان ہو جاتا اور دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس کافر نے کہا میں وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں کبھی شریک نہیں ہوں گا اور جا کر لوگوں سے کہا: جِئْتُکُمْ مِنْ اَکْرَمِ النَّاسِ ''میں اِس وقت تمہارے پاس شریف ترین انسان کے پاس سے آ رہا ہوں''۔

میں نے ضمناً یہ واقعہ اس لیے بیان کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیوں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ((مَا کُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا

کَمَکَانِھِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ''میں تو یہ نہیں گمان کرسکتا تھا کہ لوگ ہم سے اتنے فاصلے پر ہوں گے''۔ اب یہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی اِس میں ہمارے لیے ایک سبق ہے۔ اگر ظرف میں کمی ہو تو یہ وقت ہوتا ہے اپنے لیڈر کے سامنے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ترجیح قائم کرنے کا یا بالفاظِ دیگر نمبر بنانے کا۔ ہم میں سے کوئی ہوتا تو ایسے موقع پر یہی کہتا کہ حضور! لوگوں کو احساس ہی نہیں ہے' کچھ خیال ہی نہیں ہے' لوگ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں گویا خود بخود اپنی بڑائی آ جاتی ہے کہ دیکھئے میں تو بالکل آپ ﷺ کے ساتھ ہوں' میں نے اپنے آپ کو آپ ﷺ کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ لیکن یہاں عام آدمی نہیں' بلکہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں جو دوسروں کی طرف سے معذرت پیش کر رہے ہیں۔ فَقَالَ مُعَاذٌ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ نَعَسَ النَّاسُ فَتَفَرَّقَتْ بِھِمْ رِکَابُھُمْ تَرْتَعُ وَتَسِیْرُ ''تو حضرت معاذؓ نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! لوگ اونگھ رہے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سواریاں انہیں لے کر متفرق ہوگئی ہیں' کچھ چر چگ بھی رہی ہیں اور کچھ چل بھی رہی ہیں''۔ یعنی صبح کے وقت اونگھنے کی وجہ سے لوگوں پر جو غفلت طاری ہوگئی ہے اس وجہ سے وہ غیر ارادی طور پر آپ ﷺ سے دور چلے گئے ہیں۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((وَاَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں خود بھی اونگھ رہا تھا''۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو کوئی سپر ہیومن' مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش نہیں کیا' بلکہ فرمایا کہ میں خود بھی اونگھ رہا تھا۔ یہ نوٹ کرنے کا خاص اور بہت اہم مقام ہے۔ اس میں سب کی طرف سے وہ معذرت بھی قبول ہوگئی جو حضرت معاذؓ نے پیش کی اور آپؐ نے اپنی بات بھی بتا دی کہ ٹھیک ہے یہ بشری تقاضے ہیں' جو میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں دو انتہائیں ہیں۔ ایک انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو امتیازی شان ہے اس کو بڑھاتے بڑھاتے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے برابر بلکہ اُس سے بھی اونچا مقام دے دیا گیا۔ اور ایک انتہا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شان کو (معاذ اللہ) گھٹاتے گھٹاتے اپنے جیسا انسان سمجھ لیا گیا۔ بلاشبہ قرآن مجید میں یہ الفاظ تو آئے ہیں

کہ:﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ.....﴾(حٰمٓ السجدۃ:٦)''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں.....'' چنانچہ ایک اعتبار سے تو آپ ہماری ہی طرح کے بشر تھے' اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے' اسی طرح کا خون آپ کے جسم میں دوڑ رہا تھا' آپ ﷺ کو اگر زخم لگا ہے تو جسم سے خون نکلا ہے' آپ ﷺ کو بھوک بھی لگتی تھی اور پیاس بھی۔ تو معلوم ہوا کہ جو عام بشری تقاضے ہیں یہ سب آپ کے ساتھ تھے' لیکن ساتھ ہی آپ ﷺ خود فرماتے ہیں: ((اَیُّکُمْ مِّثْلِیْ))''تم میں سے کون ہے مجھ جیسا؟'' رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو''صومِ وصال'' سے منع کیا تھا۔ صومِ وصال یہ ہے کہ جو روزہ رکھا وہ شام کو افطار نہیں کیا' بلکہ وہی روزہ رات بھر آگے چلتا رہا۔ پھر اگلا دن بھی روزے کی حالت میں گزرا اور اگلے دن شام کو روزہ افطار کیا۔ تو یہ دو دن کا''صومِ وصال'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود تو دو دن کا' بلکہ کبھی کبھی تین دن کا صومِ وصال بھی رکھتے تھے' لیکن صحابہؓ کو سختی سے منع کرتے تھے۔ تو کسی نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ حضور! آپ خود تو صومِ وصال رکھتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاَیُّکُمْ مِّثْلِیْ' اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِ))(۱)''تم میں سے کون ہے مجھ جیسا؟ میں تو اس حال میں اپنی رات گزارتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے''۔ تو ہمیں اِن دو انتہاؤں کے مابین رہنا ہوگا۔ آپ ﷺ بشر تو ہیں' لیکن ہر لحاظ سے ہم جیسے بشر نہیں ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ اپنی تمام تر جلالت شان کے باوجود اللہ کے بندے ہی ہیں' اللہ کے برابر ہرگز نہیں ہیں! جیسے کسی عارف باللہ نے کہا:

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ

''بندہ تو بندہ ہی رہتا ہے چاہے کتنی بلندی پر چلا جائے (ساتویں آسمان پر پہنچ جائے) اور ربّ تو ربّ ہی رہتا ہے چاہے کتنا نزول فرما لے (آسمانِ دنیا پر

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

آجائے)''۔

بہرحال ﴿اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ﴾ ''میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں'' یہ بھی ایک حقیقت ہے اور: ((اَیُّکُمْ مِّثْلِیْ)) ''کون ہے تم میں میرے جیسا؟'' یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ اس حدیث میں آپ ﷺ اپنی طبع بشری کا تقاضا بیان کر رہے ہیں کہ: ((وَاَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ''میں خود بھی اونگھ رہا تھا''۔

فَلَمَّا رَاٰی مُعَاذٌ بُشْرٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِلَیْہِ وَخَلْوَتَہٗ لَہٗ پس جب حضرت معاذؓ نے دیکھا کہ اس وقت حضور اُن سے خوش ہیں اور ان کے لیے موقع بھی تنہائی کا ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ تیس ہزار کے لشکر میں سے ایک ہی شخص آپ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو انہیں دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی ہوگی اور اُن کے لیے آپؐ کے قلب مبارک میں یقیناً محبت کا ایک عنصر پیدا ہوا ہوگا۔ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ائْذَنْ لِیْ اَسْاَلُکَ عَنْ کَلِمَۃٍ قَدْ اَمْرَضَتْنِیْ وَاَسْقَمَتْنِیْ وَاَحْزَنَتْنِیْ ''آپؓ نے (موقع کو غنیمت جانتے ہوئے) کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپؐ سے ایسی بات پوچھوں جس نے مجھے مریض بنا کر رکھ دیا ہے' مجھے بیمار کر دیا ہے اور مجھے شدید رنج وغم سے دوچار کر دیا ہے''۔ میں اس کی فکر میں گھلا جا رہا ہوں۔ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ: ((سَلْنِیْ عَمَّ شِئْتَ)) ''تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے پوچھو جو بھی تم چاہو''۔ اب اُس وقت چونکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں بشاشت تھی' دریائے سخاوت جوش میں تھا' تو آپ ﷺ نے انہیں گویا کھلا لائسنس دے دیا کہ جو چاہو پوچھ لو۔ اب ہم یہاں اپنا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا موازنہ کر لیں کہ آپؓ کس چیز کی فکر میں گھلے جا رہے تھے' بیمار اور غمزدہ ہو رہے تھے' جبکہ ہماری پریشانیوں اور تفکرات کا محور کیا ہے!

فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ حَدِّثْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِیَ الْجَنَّۃَ لَا اَسْاَلُکَ عَنْ شَیْءٍ غَیْرَھَا ''اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے وہ عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے' اس کے سوا میں آپؐ سے اور کوئی بات نہیں پوچھوں گا''۔ آپؓ صحابیٔ رسول ہیں' بلکہ فقہاءِ صحابہؓ میں ان کا شمار ہے' نبی اکرم ﷺ سے انہیں ((اَعْلَمُھُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ)) کی سند بھی مل

چکی ہے، مگر پھر بھی وہ یہ گارنٹی نہیں سمجھتے کہ میں تو جلیل القدر صحابیٔ رسول ہوں لہٰذا میری جنت تو پکی ہے۔ بلکہ انہیں بھی یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ کیسے جنت کے حق دار بنیں۔ وہ بھی محاسبۂ اُخروی اور اُخروی قانونِ مجازات سے بے خوف نہیں ہیں۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں تو محاسبۂ اُخروی کی فکر ہی نہیں ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ بس سیدھے جنت میں جائیں گے۔

قَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ: ((بَخٍ بَخٍ، لَقَدْ سَاَلْتَ بِعَظِیْمٍ، لَقَدْ سَاَلْتَ بِعَظِیْمٍ [ثَلاثًا])) ''اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: بہت خوب، بہت خوب۔ تم نے بہت عظیم بات پوچھی، تم نے بہت عظیم بات پوچھی [یہ بات آپ ﷺ نے تین بار دہرائی]''۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ کی تحسین فرماتے ہوئے تین بار فرمایا کہ تم نے بہت عظیم بات کے بارے میں سوال کیا ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو آخرت کی فکر دامن گیر ہو جائے تو اس کی دُنیوی پریشانیاں اور تفکرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ جَعَلَ الْھُمُوْمَ ھَمًّا وَاحِدًا ھَمَّ آخِرَتِہٖ کَفَاہُ اللّٰہُ ھَمَّ دُنْیَاہُ .....))[1]

''جس شخص نے اپنے تمام تفکرات کو ایک ہی فکر کے اندر گم کر دیا، یعنی آخرت کی فکر کے اندر، تو دنیا کے سارے تفکرات کے ضمن میں اللہ اسے کفایت کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ اس کے سارے مسائل حل کر دے گا۔ یعنی تم اللہ کے بن جاؤ تو اللہ تمہارا بن جائے گا۔ جب اللہ تمہارا بن جائے گا تو پھر تمہیں کسی چیز کی فکر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اللہ کے بنو تو سہی!

رسول اللہ ﷺ آگے فرما رہے ہیں: ((وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ اَرَادَ اللّٰہُ بِہِ الْخَیْرَ)) ''اور یہ بات آسان ہے اُس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خیر کا ارادہ کر لیا ہو''۔ یعنی اے معاذ! اگر تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے اور تمہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تمہارے لیے سند ہے کہ اُس نے

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثالث، بحوالہ ابن ماجہ والبیہقی۔

تمہارے لیے خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔ فَلَمْ يُحَدِّثْهُ بِشَيْءٍ اِلَّا قَالَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حِرْصًا لِكَيْمَا يُتْقِنَهُ عَنْهُ ''تو آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے کوئی بات نہیں فرمائی مگر یہ کہ اسے تین مرتبہ دہرایا' اس خواہش کے تحت کہ وہ اسے اچھی طرح یاد کر لیں''۔ آپ ﷺ نے ہر بات کو تین تین بار دہرایا تا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ذریعے آپ ﷺ کی بات جوں کی توں لوگوں تک پہنچ جائے اور اس کا ایک لفظ بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔

اب یہاں رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سوال کا جو جواب دے رہے ہیں تو اس ایک جملے میں کل دین کی جامع تعبیر آ گئی ہے۔ آگے چل کر آپ ﷺ نے اسی دین کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بیان فرمایا ہے۔ اس طرح اس حدیث کی حدیث جبریلؑ کے ساتھ ایک اور مشابہت بھی بن رہی ہے' اس لیے کہ وہاں بھی تین چیزوں اسلام' ایمان اور احسان پر زور دیا گیا ہے۔ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا حَتّٰى تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ)) ''تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! تم پختہ ایمان رکھو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر' اور نماز قائم کرو اور اکیلے اللہ کی بندگی اور پرستش کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے' یہاں تک کہ اسی حالت میں تم کو موت آ جائے''۔ یعنی یہ تین کام کرنے سے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

نوٹ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلی بات جو فرمائی ہے وہ ایمان کی ہے' اسلام کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام تو نقطۂ آغاز ہے' جبکہ اصل شے تو ایمان ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ)) ''تم پختہ ایمان رکھو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر''۔ دوسری بات فرمائی: ((وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ)) ''اور نماز قائم کرو''۔ اللہ پر ایمان کو تازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ تیسری بات فرمائی: ((وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا)) ''اور اکیلے اللہ کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتے ہوئے''۔

یہاں لفظ ''عبادت'' اور ''شرک'' آئے ہیں۔ عبادت کا مفہوم صرف نماز روزہ تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس پر تفصیلی گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں کہ عبادتِ الٰہی کا مطلب ہے

انتہائی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت' ہمہ جہت اور کامل اطاعت وفرماں برداری کرنا۔ دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور جو لوگ (سچے) مؤمن ہیں ان کو شدید محبت ہے اللہ سے''۔ عبادت کے لیے فارسی کا ایک لفظ ہے ''بندگی'' اور ایک ہے ''پرستش''۔ ان دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت بنے گی۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں''۔ تو یہاں عبادت سے مراد محض عبادات یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بھی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شامل ہیں مگر عبادتِ الٰہی صرف انہی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔

یہاں عبادت کے بعد دوسرا لفظ ''شرک'' آیا ہے کہ: ((لَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا)) ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''۔ یہاں بھی نوٹ کیجیے کہ شرک بھی صرف بُت پرستی کا شرک نہیں ہے کہ بت پرستی چھوڑ دو تو شرک ختم ہو گیا' بلکہ نفس پرستی بھی تو بہت بڑا شرک ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثیۃ:۲۳) ''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟'' تو خواہش نفس بھی تو معبود ہو جاتی ہے۔ اگرچہ نفس کی نماز تو کوئی نہیں پڑھتا مگر نفس کی اطاعت تو کر رہے ہیں! اندر سے نفس کا جو تقاضا ابھرتا ہے تو یہ دیکھے بغیر کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے' شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز ہے' بس وچشم اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تو گویا نفس انسان کا معبود بن گیا۔ اسی طرح مال کی محبت میں اس درجے سرشار ہو جانا کہ اس کے حصول میں حلال اور حرام کی تمیز ختم ہو جائے' تو یہ مال کی بندگی ہے اور ایک درجے کا شرک ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))[1]

''ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہو گیا) دینار و درہم کا بندہ''۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل اللّٰه۔

تو یہاں بھی آپ ﷺ ''عبد'' کا لفظ لائے ہیں کہ کہنے کو تو تم اللہ کے بندے بنے پھرتے ہو جبکہ حقیقت میں تم مال کے بندے ہو۔ دیکھئے ہندو لکشمی دیوی کی پوجا کرتا ہے کہ وہ اسے مال عطا کر دے' جبکہ ہم براہِ راست مال کے پجاری ہیں۔ ہم نے صرف لکشمی دیوی کو درمیان میں سے ہٹایا ہے' باقی ہمارا اور ہندوؤں کا اصل معبود تو مال ہی ہے۔ لکشمی دیوی تو درمیان میں محض واسطہ ہے۔ تو شرک محض بُت پرستی کا نام نہیں ہے' بلکہ شرک اور بھی بہت سے ہیں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک عرصہ قبل ''حقیقت و اقسامِ شرک'' کے موضوع پر ایک ایک گھنٹے کی چھ تقاریر کی تھیں (۱) کہ شرک عقیدے کا بھی ہے' عمل کا بھی ہے اور شرک انفرادی بھی ہے' اجتماعی بھی ہے۔ آج کا سب سے بڑا شرک اجتماعی شرک یعنی انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا کہ ''اَلْمَلِک'' تو صرف اللہ ہے لیکن یہاں انسان خود خدا بن کر بیٹھ گیا ہے۔ بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

مادہ پرستی بھی بہت بڑا شرک ہے۔ آج انسان کا سارا توکل اللہ کی ذات کے بجائے اسباب و وسائل پر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿.....اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل) ''.....کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز نہ سمجھ بیٹھنا''۔ اسی طرح ریاکاری کو شرکِ خفی قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ نبویؐ ہے:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (۲)

---

(۱) محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کی یہ چھ تقاریر کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ضروری ایڈیٹنگ کے بعد ماہنامہ ''میثاق'' میں فروری ۲۰۰۶ء سے جولائی ۲۰۰۶ء کے دوران ''حقیقت و اقسام شرک'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں اور ان شاء اللہ العزیز عنقریب کتابی شکل میں شائع ہو جائیں گی۔ دلچسپی رکھنے والے افراد ان سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ (مرتب)

(۲) مسند احمد۔

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ دیا وہ شرک کر چکا۔''

عربی زبان میں فعل ماضی پر ''قَدْ'' آ جائے تو یہ ماضی قریب یا present perfect tense کا معنی دیتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ''میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں'' تو اس میں ایک شبہ ہے کہ وہ یہ کام کر سکے گا یا نہیں' لیکن اگر وہ یہ کہے کہ ''میں یہ کام کر چکا ہوں'' تو اس میں تو اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس حدیث میں تین مرتبہ ''فَقَدْ اَشْرَکَ'' فرمایا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ بات بڑی باریک بینی سے واضح فرما دی ہے کہ دکھاوے کی خاطر نماز پڑھنے والا' روزہ رکھنے والا اور صدقہ کرنے والا بلا شک وشبہ شرک میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم نماز پڑھ رہے ہو اور تم دیکھو کہ کوئی شخص تمہیں دیکھ رہا ہے لہٰذا تم سجدہ طویل کر دو تو تمہارا یہ عمل شرک شمار ہوگا۔ اس لیے کہ عام حالات میں اگر تمہارا سجدہ تین سیکنڈ کا ہو رہا تھا اور اب پانچ سیکنڈ کا ہو گیا ہے تو یہ مزید دو سیکنڈ کا سجدہ کس کے لیے ہے؟ اب اس ایک سجدے کے گویا دو مسجود ہو گئے' ایک اللہ تعالیٰ اور دوسرا وہ شخص جسے دکھایا جا رہا ہے۔ تو ایمان اور بندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا اور شرک کی تمام کیفیتوں سے بچنا' یہ ہے ایک جملے میں نجات کا نسخہ: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا)) .

آگے فرمایا: ((حَتّٰى تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ)) ''یہاں تک کہ اسی حالت میں تمہاری موت واقع ہو جائے''۔ یعنی اگر تمہارا اللہ اور یوم آخرت پر پختہ ایمان ہے' اور تم اللہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے تمام لوازمات کے ساتھ نماز ادا کرتے رہو' صحیح معنوں میں اللہ کی بندگی کرو اور شرک کی تمام حالتوں اور کیفیات سے مجتنب رہو اور زندگی بھر تمہاری یہی کیفیت رہے' شیطان یا تمہارا اپنا نفس تمہیں کوئی اڑنگا نہ لگا دے کہ تم منہ کے بل گر جاؤ' تو تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اربعین نوویؒ کی حدیث نمبر ۴ جو اِن شاء اللہ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی' اس میں اصل مضمون یہی ہے کہ ایک شخص ساری عمر اچھے کام

کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے‘ لیکن موت کے قریب آ کر اچانک ایسا پلٹا کھاتا ہے کہ سب کیا کرایا غارت چلا جاتا ہے اور جہنم اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص ساری عمر برے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم کے قریب پہنچ جاتا ہے‘ لیکن آخری ایام میں ایسے عمل کرتا ہے کہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ یہاں فرما رہے ہیں: ((حَتّٰی تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰی ذٰلِکَ)) ’’یہاں تک کہ اسی کیفیت میں تم پر موت آ جائے‘‘۔

فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ اَعِدْلِیْ‘ فَاَعَادَھَا لَہٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ’’حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضور! ذرا مجھے دوبارہ یہ بات فرما دیجیے‘ تو آپ ﷺ نے ان کے لیے یہ بات تین بار دہرائی‘‘۔ **ثُمَّ قَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ: ((اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ یَا مُعَاذُ))** ’’پھر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں ......‘‘ اب یہاں دیکھئے کہ دریائے سخاوت جوش میں آیا ہوا ہے اور آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں مزید کچھ بھی بتاؤں۔ اور وہ کیا ہے: **((بِرَأْسِ ھٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَۃِ السَّنَامِ))** ’’اس دین کی جڑ اور بلند ترین چوٹی کے بارے میں (کہ دین کی جڑ اور چوٹی کیا ہے)‘‘۔ اب یہاں سے حکمت دین کا موضوع شروع ہو رہا ہے کہ دین کے اجزاء کون کون سے ہیں۔

فَقَالَ بِاَبِیْ وَاُمِّیْ اَنْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ فَحَدِّثْنِیْ ’’تو حضرت معاذ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبیؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے ضرور بتائیے!‘‘ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ ان کو بونس مل رہا ہے کہ جو کچھ پوچھا تھا اس سے آگے کی بات سامنے آ رہی ہے۔ **فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ: ((اِنَّ رَأْسَ ھٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ))** ’’تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: یقیناً دین کی جڑ یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود نہیں سوائے تنہا اللہ تعالیٰ کے جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں‘‘۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ایمان کی بات نہیں ہوئی‘ بلکہ شہادت کی بات ہوئی ہے جو اسلام کی جڑ ہے۔

آ گے فرمایا: ((وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکَاۃِ)) ''اور اس دین کو قائم رکھنے والی اور اس کی شیرازہ بندی کرنے والی چیز ہے نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا''۔ ((وَاَنَّ ذِرْوَۃَ السَّنَامِ مِنْہُ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) ''اور اس کی بلند ترین چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ گویا یہ ایک درخت ہے جس کی جڑ ہے شہادت۔ اور اس کا تنا جس کے اوپر یہ درخت کھڑا ہے وہ ہے نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اور اس کی چوٹی ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے دین کو ایک درخت کی مثال سے تین حصوں میں تقسیم کر کے واضح فرما دیا۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک درخت کی مثال بیان فرمائی ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابراھیم) ''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے دیکھا نہیں کیسے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی ایک پاکیزہ کلمے کی جیسے ایک پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ (زمین میں) مضبوطی سے قائم ہوتی ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں؟''

اب اس جہاد کے ضمن میں ایک خاص بات جو سامنے آ رہی ہے وہ مشکلات الحدیث میں سے ہے۔ قرآن و حدیث کے بعض مضامین جو مشکل ہیں، جن کا افہام و تفہیم آسان نہیں ہے اور عام لوگوں نے ان کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں، ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے۔ آپ ﷺ فرما رہے ہیں: ((وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ)) ''اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔ ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) ''پس جب وہ یہ کام کر گزریں تو وہ محفوظ ہو گئے، اور انہوں نے اپنی جانیں اور مال محفوظ کر لیے سوائے شریعت کے حق کے (یعنی

سوائے اس کے کہ ان پر کوئی شرعی حق واقع ہو جائے) اور اُن کا حساب اللہ عزیز و جلیل کے سپرد ہے''۔ یعنی مسلمان ہونے کے لیے تو یہ چیزیں کافی ہیں' یعنی نماز' زکوٰۃ اور شہادتین' اس سے امان حاصل ہو جائے گی' لیکن اگر کسی پر کوئی شرعی حد قائم ہو جائے تو وہ نافذ ہو گی' مثلاً چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا' غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے گا' وغیرہ۔

یہاں یہ اہم بات نوٹ کر لیجیے کہ لوگوں سے جنگ کرنے کا متذکرہ بالا حکم عام حکم نہیں ہے' بلکہ یہ خاص مشرکین عرب کا معاملہ تھا۔ اس ضمن میں سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات کو سمجھنے میں بھی اکثر لوگوں کو بہت مغالطہ ہوا ہے۔ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ہے' جس کو بہت کم لوگوں نے صحیح طور پر سمجھا ہے اور اس سے غیروں کو اعتراض کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان آیات میں جو حکم وارد ہوا ہے کہ ایمان لاؤ' یا پھر قتل کر دیے جاؤ گے' تو دشمنوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اسلام تو تلوار کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ حالانکہ یہ خاص بنی اسماعیل یعنی اُمیین کے لیے حکم تھا جن کی طرف رسول اللہ ﷺ کی اصل بعثت ہوئی تھی' کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت رہی ہے کہ جس قوم کی طرف معین طور پر کسی رسول کو بھیج دیا جاتا اور وہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے اتمامِ حجت کر دیتے' لیکن پھر بھی وہ قوم ایمان نہ لاتی تو وہ ہلاک کر دی جاتی۔ قرآن مجید کے اندر ایسی قوموں کے حالات و واقعات موجود ہیں۔ قومِ نوحؑ' قوم ہودؑ' قوم صالحؑ' قوم لوطؑ' قوم شعیبؑ اور آلِ فرعون' یہ سب قومیں اسی قانون کے تحت ہلاک کی گئیں۔ سورۃ التوبۃ کی اِن آیات میں بھی معین طور پر بنی اسماعیل کے لیے حکم نازل ہوا کہ تمہیں چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے' اس کے اندر ایمان لے آؤ' ورنہ تمہارا قتل عام ہو گا۔ اگرچہ بالفعل اس کی نوبت نہیں آئی' اس لیے کہ زیادہ تر لوگ ایمان لے آئے اور باقی عرب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو اِس حدیث میں جو بات بیان ہو رہی ہے وہ عام نہیں ہے' بلکہ اسی خاص پس منظر میں بیان ہو رہی ہے اور یہ حکم اُمیین عرب کے لیے معین ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ

کی بعثت اُمیین عرب کے لیے خاص تھی اور باقی اہل عالم کے لیے عام تھی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ .....﴾ (الجمعة:٢)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اُمیین میں ایک رسول خود انہی میں سے.....''

آگے جو رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں: ((وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) ''اور اُن کا حساب اللہ عزیز وجلیل کے ذمہ ہے'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دل سے ایمان لا رہا ہے یا یونہی جان بچانے کے لیے ایمان لا رہا ہے یہ اللہ جانے اور وہ جانے' میرے ہاں اس کا اسلام قبول کر لیا جائے گا۔ اور ہم یہ بات تفصیلاً جان چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے اسلام یا اپنے ایمان کا زبان سے اقرار کر رہا ہے' چاہے اس کے دل میں جو کچھ بھی ہو' تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جان بچانے یا اسلامی ریاست میں حقوق حاصل کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہے' بلکہ وہ قانونی طور پر مسلمان ہے اور اس کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو ایک سچے اور پکے مسلمان کے ہیں۔

اس حدیث پر گفتگو آئندہ نشست میں جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم اور تفقہ عطا فرمائے اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی هذا واستغفراللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: طارق اسماعیل ملک' ادارتی معاون)

درس ۱

فرائض دینی کا جامع تصور

اور

جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد و مراحل

(گزشتہ سے پیوستہ)

انجینئر نوید احمد ☆

سورۃ الصّف، آیات ۹۔۱۲

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۲﴾ (الصّف)

☆ آیت ۹:

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو''.....

﴿بِالْهُدٰی﴾ ''کامل ہدایت کے ساتھ''.....﴿وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ ''اور سچّے دین کے ساتھ''.....

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''تاکہ وہ اس کو غالب کر دیں کل نظامِ زندگی پر'' ..... ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۹﴾ ''اور چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے''۔

اِس آیت میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا غلبۂ دینِ حق۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کو یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ انسان ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ اُس کا کوئی واضح مقصدِ زندگی ہو۔ مقصدِ زندگی کم تر بھی ہوسکتا ہے اور اعلیٰ بھی۔ اعلیٰ ترین مقصد تھا نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا' یعنی دینِ حق کی سربلندی۔ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اُنہیں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کو اپنا مقصدِ زندگی بنانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ تاحیات اِس سعادت پر قائم رہنے اور دوسروں کو بھی اِس خیر کی طرف متوجہ کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ''الھدٰی'' یعنی کامل ہدایت اور ''دینِ حق'' یعنی ایک عادلانہ نظامِ حیات کے ساتھ بھیجا۔ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں پر واضح کریں کہ قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے اور اِس کی تعلیمات کا سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اِسی طرح اسلام محض مذہب نہیں بلکہ دین ہے' جو نہ صرف ہماری انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی سے متعلق بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہم انفرادی زندگی میں اِس کی تعلیمات پر عمل کریں اور اجتماعی زندگی سے متعلق اِس کے احکامات کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں۔

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ ''اور چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے'' کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ غلبۂ دین کی جدوجہد آسان نہیں' بلکہ اِسے لازماً مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نظامِ باطل سے بااختیار طبقہ کے کچھ مفادات اور چودھراہٹیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ طبقہ دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیاشی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ طبقہ آسانی سے اپنے مفادات سے دستبردار نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی تحریک اِس طبقہ کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے اُٹھتی ہے تو یہ طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اِس تحریک کو کچلنے کے لیے پوری قوت صرف کرتا ہے۔ یہ طبقہ دو طرح کے مشرکین پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک مذہبی شرک کرنے والے اور دوسرے سیاسی شرک کرنے والے۔ مذہبی شرک کے پیشوا پنڈت' پادری' پروہت' پجاری اور پیر کی صورت میں اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ بن کر عوام کی محنت کی کمائی سے نذرانے اور چڑھاوے وصول

کرتے رہے ہیں، اور سیاسی شرک کے سردار بادشاہوں کے روپ میں Divine rights of kings کا تصور دے کر اپنی حاکمیت قائم کر کے عوام سے خراج وصول کرتے رہے۔ دونوں استحصالی عناصر کا ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا۔ بادشاہ مذہبی پیشواؤں کو His Holiness کی سند دیتا رہا اور مذہبی پیشوا بادشاہوں کو Defenders of the faith کا اعزاد دیتے رہے۔ دینِ حق یعنی اسلام اِن دونوں طبقات کے مفادات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ مذہبی شرک کے سدباب کے لیے اسلام توحید کا وہ تصور دیتا ہے جو خالق ومخلوق کے درمیان حائل تمام واسطوں اور وسیلوں کی نفی کر دیتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ.....﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (انہیں بتا دیجیے کہ) بے شک میں قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اُس کی دعا قبول کرتا ہوں.....''

بقول اقبال : ؎

کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اِسی طرح اسلام سیاسی شرک کے ابطال کے لیے حاکم مطلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔ اِرشاداتِ باری تعالیٰ ہیں :

﴿وَلَمْ یَکُنْ لَّـهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ﴾ اسراء یل : ۱۱۱)

''اور حکومت میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے''۔

﴿وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکھف)

''اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔

﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ﴾ (یوسف: ۴۰)

''حکومت تو بس ایک اللہ ہی کی ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو''۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (المائدۃ)

''اور جو اللہ کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ

کافر ہیں''۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾(المائدۃ)

''اور جو اللہ کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں''۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾(المائدۃ)

''اور جو اللہ کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں''۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

اسلام نے انسانوں کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر صرف اور صرف اللہ کی غلامی کے رنگ میں رنگ دیا اور بادشاہت کے بجائے خلافت کا تصور دیا۔ اب جن لوگوں کے مفادات پر اسلام کی انقلابی دعوت کی ضرب پڑتی ہے اُن کے لیے اِس دعوت کا پھیلنا ناگوار ہوتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''گراں ہے (اے نبی ﷺ!) مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ ان کو دعوت دے رہے ہیں''۔

اگر کوئی شخص صرف واعظ بن کر یا محض جزوی اصلاح کا مقصد لے کر کھڑا ہو تو اِس کی بات لوگوں پر گراں نہیں گزرتی۔ اگر دین کی محض وہ باتیں پیش کی جائیں جن سے کسی کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو پھر کسی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوتی' بلکہ پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں اور شاندار استقبال کیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر کوئی اِس بات کا مشن لے کر اُٹھے کہ میں اِس پورے نظامِ باطل کو' جو غیر اللہ کی اطاعت پر قائم ہے' بالکل نیست و نابود کر دوں گا اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کروں گا' تو اِس سے مشرکانہ بنیادوں پر قائم نظامِ باطل کے سرداروں کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام ختم ہوا تو ہمارے مفادات پر ضرب پڑے گی' ہماری چودھراہٹ نہیں رہے گی اور ہمارا وقار اور احترام خاک میں مل جائے گا۔ اِس لیے توحید پر مبنی اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کی دعوت مشرکانہ نظام کے سرداروں کو برداشت نہیں ہو سکتی اور

وہ اِس مشن کو نا کام کرنے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں بھرا بستر ہے۔

اِس آیت میں ہمارے لیے ایک حوصلے کا پہلو بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے دینِ حق کا غلبہ۔ چونکہ آپ ﷺ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے‘ رہتی دنیا تک اور پورے کرۂ ارضی کے لیے ہے لہٰذا ایک وقت ایسا آ کر رہے گا جب پورے کرۂ ارضی پر آپ ﷺ کا لایا ہوا دین غالب ہو کر رہے گا۔ اِس کی بشارت خود اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے کئی ارشادات میں بیان فرمائی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رضی اللہ عنہ عَنِ الْحُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ‘ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا‘ ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ‘ فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ‘ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا‘ ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا‘ فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكُوْنَ‘ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا‘ ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً‘ فَتَكُوْنُ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ‘ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَآءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا‘ ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ(۵)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ’’(اے مسلمانو!) نبوت تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا (یعنی نبی کریم ﷺ کی بنفس نفیس موجودگی)۔ پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت کا دَور آئے گا‘ یہ دَور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اُسے اُٹھا لے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی جو اُس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اُسے بھی ختم کر دے گا۔ پھر مجبوری کا دَورِ حکومت ہوگا‘ جو اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر اُسے بھی جب چاہے گا ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے طریقے پر خلافت کا دَور آئے گا‘‘۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا‘ وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا))(۶)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے میرے

لیے زمین کو لپیٹ دیا' پس میں نے اُس کے تمام مشرق و مغرب دیکھ لیے' اور میری اُمت کی حکومت زمین پر وہاں تک پہنچ کر رہے گی جو میرے لیے لپیٹ دی گئی''۔

عَنِ الْمِقْدَادِ ﷺ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ' اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا' اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) قُلْتُ: فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

حضرت مقداد ؓ راوی ہیں کہ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ''روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے' خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر اور خواہ کسی بد بخت کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جن کو عزت عطا فرمائے گا اُنہیں کلمۂ اسلام کا قائل بنا دے گا اور جن کو ذلیل فرمائے گا اُنہیں اِس کے تابع فرما دے گا۔ حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ اِس پر میں نے (دل میں) کہا: ''پھر تو یقیناً دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا''۔

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت غلبۂ دینِ حق ہے اور یہ کام ہو کر رہے گا۔ البتہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ اِس مشن کی تکمیل کے لیے اللہ کے بندوں کو جان و مال کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزے کے ذریعے قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلوادی' لیکن دین کا غلبہ معجزے سے نہیں ہوا' اِس کے لیے اُنہوں نے قوم کو مال اور جان لگانے کی دعوت دی۔ اگلی آیت میں اِسی کی ترغیب ہمیں دی جا رہی ہے۔

☆ آیت ۱۰ :

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو'' ..... ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ﴾ ''کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں'' ..... ﴿تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝١٠﴾ ''جو تمہیں بچا لے دردناک عذاب سے؟''

اِس آیت میں بڑے فطری اسلوب میں' انسانی نفسیات کے بہت قریب ہو کر' ایک سوالیہ انداز میں اہلِ ایمان کو متوجہ کیا گیا ہے۔ ہر انسان ایسی تجارت کا خواہش مند ہوتا ہے جس میں خسارے کا اندیشہ نہ ہو۔ یہاں ایسی تجارت کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ہمیشہ ہمیش کے خسارے یعنی

دردناک عذاب سے انسان کو بچالے گی۔ تربیتی نقطۂ نگاہ سے یہ بڑا مفید اسلوب ہے کہ پہلے ایک سوال کیا جائے اور پھر اُس کا جواب دیا جائے۔ حدیثِ جبرائیلؑ میں حضرت جبرائیلؑ نے اللہ کے رسول ﷺ سے اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کیے اور آپ ﷺ نے جوابات دیے۔ آپ ﷺ اکثر یہ اسلوب اختیار فرماتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر انسان ایک تجارت تو کر رہا ہے۔ وہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنا وقت، صلاحیت اور توانائی خرچ (invest) کر رہا ہے۔ ایک حدیث میں اِس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا:

((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْا فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))[۸]

''ہر انسان صبح کرتا ہے اور اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، پس وہ اُسے (عذاب سے) آزاد کرنے والا ہے یا اُس کو (اللہ کی رحمت سے محروم کر کے) ہلاک کرنے والا ہے''۔

انسان کی محنت اور صلاحیت کی خریدار دنیا کی عارضی لذتیں بھی ہیں اور اللہ بھی۔ اگر ہم نے اپنی صلاحیتیں صرف دنیا کی عارضی لذتوں کے حصول کے لیے کھپا دیں تو یہ بہت ہی گھاٹے کا سودا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ (الکھف)

''(اے نبی ﷺ!) اِن سے کہہ دیجیے کیا ہم تمھیں بتائیں سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہیں اپنے اعمال کے اعتبار سے؟ وہ لوگ جن کی ساری محنتیں بھٹک کر رہ گئیں دُنیوی زندگی کے لیے اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے''۔

اِس کے برعکس اگر ہم نے سودا اللہ کے ہاتھ کیا تو ہمیشہ ہمیش کی جنت ہمیں نصیب ہوگی اور یہی سب سے زیادہ نفع بخش سودا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾﴾ (التوبۃ)

''اللہ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لیے ہیں (اور اِس کے)

عوض میں اُن کے لیے جنت (تیار کی) ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنا وعدہ وفا کرنے والا ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اُس سودے پر جو تم نے کیا ہے' اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے''۔

بلاشبہ اصل عقل مند اور دور اندیش وہ ہے جو دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی ابدی نعمتوں کے حصول کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ)) (۹)

''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالے اور عمل کرے موت کے بعد کی زندگی کے لیے''۔

ایسے عقل مند لوگ کامیاب ترین تجارت میں اپنے شب و روز لگا رہے ہیں :

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر)

''بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور قائم کرتے ہیں نماز اور جو کچھ ہم نے اُنہیں دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں' وہ ایسی تجارت کی توقع کرتے ہیں جو کبھی گھاٹے میں نہیں جائے گی''۔

☆ آیت ۱۱:

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر''..... ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے''..... ﴿ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جان لو''۔

آیت ۱۰ میں بیان شدہ سوال کا جواب اِس آیت میں دیا گیا ہے۔ دردناک عذاب سے بچنے کے لیے دو کام کرنا ہوں گے۔ پہلا یہ کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنا ہوگا' اور دوسرا یہ کہ اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرنا ہوگا۔

یہ حقیقت قرآنِ حکیم میں بڑے جھنجھوڑنے کے انداز میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ آخرت میں دردناک عذاب سے نجات کے لیے مال و جان کی قربانیاں پیش کرنی پڑیں گی:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ (البقرۃ)

''(اے مسلمانو!) کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ جنت میں (آسانی سے) داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات وارد ہی نہیں ہوئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے؟ اُن پر سختیاں اور تکالیف آئیں اور وہ ہلا ڈالے گئے' یہاں تک کہ پکار اٹھا (وقت کا) رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ (اِس وقت اُنہیں بتایا گیا کہ) آگاہ رہو' اللہ کی مدد قریب ہے''۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾﴾ (آلِ عمران)

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (بے آزمائش) جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے ظاہر ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کون جہاد کرنے والے ہیں اور کون صبر کرنے (ڈٹ جانے) والے ہیں!''

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً﴾ (التوبۃ : ١٦)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ چھوڑ دیے جاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے ایسے لوگوں کو ظاہر کیا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اُس کے رسول اور مؤمنوں کے سوا کسی کو دِلی دوست نہیں بنایا''۔

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾﴾ (العنکبوت)

''کیا لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے محض اِس لیے کہ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا''۔

گویا دردناک عذاب سے نجات اور جنت کا حصول آسان نہیں' اِس کے لیے محنت کرنا پڑے گی اور آزمائش کی بھٹیوں سے لازماً گزرنا پڑے گا۔

آیت زیرِ درس میں دردناک عذاب سے بچنے کی پہلی شرط یہ بیان ہوئی کہ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر۔ مراد یہ ہے کہ تمہیں ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَان'' یعنی زبانی اقرار کی بنیاد پر قانونی ایمان تو حاصل ہے' لیکن اب ''تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ'' یعنی یقینِ قلبی کے حصول کی

کوشش کر کے ایمانِ حقیقی سے باطن کو منور کرو۔ یہ وہی انداز ہے جو سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ میں آیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ.....﴾

''اے اہل ایمان! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر.....''

گویا دردناک عذاب سے بچنے کی پہلی شرط ہے ایمانِ حقیقی کا حصول۔ یعنی ایسا ایمان جو انسان کا حال بن جائے اور انسان کے سیرت و کردار میں نظر آئے۔ یہ ایمان حاصل ہوگا دینی اجتماعات میں شرکت سے، اپنے دینی ساتھیوں کے ساتھ قریبی میل جول سے اور قرآنِ حکیم پر غور و تدبر سے۔ ایمان کے حوالے سے یہاں صرف دو ایمانیات کا ذکر ہے، یعنی توحید اور رسالت۔ توحید تو تمام ایمانیات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ رسالت پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اُن تمام باتوں کی تصدیق کرنا جو اللہ کے رسول ﷺ نے بیان فرمائیں۔ گویا باقی تمام ایمانیات بھی ایمان بالرسالت میں شامل ہو گئے۔

اِس آیت میں دردناک عذاب سے بچنے کی دوسری شرط یہ بیان ہوئی کہ مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ سورۃ الحجرات میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ جہاد فی سبیل اللہ ایمانِ حقیقی کا لازمی مظہر ہے :

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''مؤمن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی لوگ سچے ہیں''۔

اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے کوشش کرنا اور اِس مشن کو اپنی زندگی میں ترجیحِ اوّل دینا دراصل اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے محبت کا عملی ثبوت ہے۔ انسان کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اُسے اللہ سے کس قدر محبت ہے اور وہ دیگر حقوق کے مقابلے میں اللہ کی عبادت اور اُس کے دین کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے کتنی محنت کر رہا ہے۔ اِسی طرح انسان کا عمل بتاتا ہے کہ نفسانی خواہشات اور معاشرتی رسم و رواج کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو وہ کس قدر اہمیت دیتا ہے اور آپ ﷺ کی پیروی میں غلبۂ دین کے لیے جدوجہد میں کس قدر مال و جان لگا رہا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی منازل ومراحل

یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ جہاد کو صرف قتال کے معنی میں لے لیا جاتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی تین منازل ہیں، جن میں آخری اور بلند ترین منزل ہے قتال فی سبیل اللہ۔ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اپنے دائرۂ اختیار میں دین غالب کرنا۔ بقول جگر مرادآبادی :

مری طرف سے کوئی یہ کہہ دے مجاہد بے خبر سے پہلے
صفائے قلب و نظر ہے لازم جہادِ تیغ و تبر سے پہلے

جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ہے نظریاتی سطح پر جہاد کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں دین غالب کرنے کی دعوت دینا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (الفرقان)

''پس (اے نبی ﷺ!) ان کافروں کی بات نہ مانئے اور قرآن کے ذریعے اِن سے جہاد کیجیے بہت بڑا جہاد''۔

جہاد کی تین منازل اور اِن کے مراحل کی تفصیل کچھ اِس طرح ہے :

☆ پہلی منزل: ذاتی زندگی میں اللہ کی کامل بندگی کے لیے جہاد:

یہ جہاد فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل ہے۔ اِس منزل پر جہاد کے تین مراحل ہیں :

(i) **نفس کے خلاف جہاد:** اِس جہاد کو نبی اکرم ﷺ نے افضل جہاد قرار دیا ہے:

﴿اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِي ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ﴾

''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور خواہشات کے خلاف اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو''۔

انسان کے لیے اللہ کی بندگی کے حوالے سے ایک بڑی رکاوٹ یہ نفس پیدا کرتا ہے :

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست
لیک اُو را عون اِیں را عون نیست

(ii) **شیطان کے خلاف جہاد:** ذاتی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی کے لیے دوسری بڑی رکاوٹ شیطان ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا﴾ (فاطر: ٦)

''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اُسے دشمن ہی سمجھو''۔

(iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد: بگڑا ہوا معاشرہ انسان کو دنیاداری کے حوالے سے دوسروں کے ساتھ ایک مقابلہ میں داخل کر دیتا ہے۔ اُس کی ترجیح دُنیوی لذتوں کا حصول بن جاتی ہے' لہٰذا اُس کے لیے اللہ کی بندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں خبردار کیا گیا :

﴿وَاِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ (الانعام: ١١٦)

''اور اگر تم کہنا مانو گے اُن لوگوں کی اکثریت کا جو زمین پر آباد ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے''۔

زمانے کے ساتھ بہہ جانا آسان ہوتا ہے لیکن اُس کے خلاف رُخ اختیار کرنا جان جوکھوں کا کام ہے ؎

کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثرؔ
اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!

☆ دوسری منزل: دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینے کے لیے جہاد:

جہاد فی سبیل اللہ کی اِس دوسری منزل پر بھی تین مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ اِن مراحل کا ذکر سورۃ النحل (آیت ١٢٥) میں اِس طرح بیان ہوا :

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾

''(اے نبی ﷺ!) بلایئے اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت سے اور عمدہ (دردبھری) نصیحت سے اور اُن سے بحث کیجیے عمدہ طریقہ سے''۔

(i) حکمت کے ذریعہ دعوت: یعنی دلائل کے ساتھ معاشرے کی ذہین اقلیت کو دین کی طرف متوجہ کرنا۔ دعوت کا ہدف اگر نظام کی تبدیلی ہے تو اِن لوگوں کے ذہن تبدیل کرنا اوّلین اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ نئے نظام کی تعمیر اور اُسے چلانے کی صلاحیت اِن ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔

(ii) موعظۂ حسنہ: یعنی دردبھری مؤثر نصیحت کے ذریعے عوام الناس کو غفلت سے نکال

کر دین پر عمل کے لیے آمادہ کرنا۔ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق علمیت کے اظہار سے پاک اور پُر سوز وعظ و نصیحت کے ذریعے عوام کو دین کی دعوت دینا مفید ثابت ہوتا ہے : ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے!

(iii) مجادلۂ احسن: یعنی اعتراضات کرنے، فتنے اٹھانے اور گمراہ کن نظریات کا پرچار کرنے والوں کے ساتھ مہذب انداز اور شائستہ اسلوب سے بحث و مباحثہ کرنا۔

☆ تیسری منزل: اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے جہاد:

اِس منزل پر جہاد کے لیے بھی تین ہی مراحل ہیں:

(i) صبرِ محض (Passive Resistance): یعنی ہر طنز و تشدد کے مقابلہ میں جوابی اقدام کیے بغیر اپنے موقف پر ڈٹے رہنا۔ دعوت اگر انقلابی ہو، یعنی اگر اُس کا ہدف ظالمانہ نظام کی تبدیلی ہو تو نظامِ باطل سے مفادات حاصل کرنے والے لازماً اُس کی مخالفت کریں گے۔ مخالفت کے جواب میں پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ بدلہ نہ لیا جائے لیکن اپنے موقف پر ثابت قدمی دکھائی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اِسی روش کی تلقین فرمائی، جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت ۷۷ میں اِس طرح کیا گیا :

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ.....﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا اپنے ہاتھ روکے رکھو.....''

مخالفت کے جواب میں صبرِ محض کی پالیسی کی حکمت یہ ہے کہ :

- نظامِ باطل کے پاس انقلابی جماعت کو مکمل طور پر کچلنے کا اخلاقی جواز نہ ہو۔
- دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور برائی کا جواب برائی سے نہ دے کر معاشرے کی خاموش اکثریت کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدة)

''اور نیکی و بدی برابر نہیں ہوتیں۔ جواب دو (بدی کا) اُس طور پر جو بہت اچھا ہو تو وہ کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست''۔

- ساتھیوں کی تربیت کے لیے مہلت لی جا سکے۔

- ساتھیوں میں انتقام کے جذبے کو پکایا جائے تا کہ وقت آنے پر باطل کے خلاف بھرپور وار کیا جا سکے۔ بقول علامہ اقبال:۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اِسے اور ذرا تھام ابھی!

(ii) اقدام (Active Resistance): یعنی مناسب قوت و اسباب فراہم ہوتے ہی نظامِ باطل کو چھیڑنا۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کے دوران مسلمانوں کو قریش کے خلاف اقدام کی اجازت دی گئی' از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ (الحج : ۳۹)

''اجازت دے دی گئی (جنگ کی) اُن کو جن سے (بلا وجہ) لڑائی کی جا رہی ہے' کیونکہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے''۔

نبی اکرم ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے چھ ماہ بعد قریش کی معاشی اعتبار سے شہ رگ یعنی اُن کی تجارت کے خلاف اقدام کے طور پر اُن کے تجارتی قافلوں کے راستوں کی نگرانی اور پھر اُن پر حملوں کا فیصلہ فرمایا۔

(iii) مسلح تصادم (Armed Conflict) یا قتال فی سبیل اللہ: یعنی اقدام کے نتیجے میں نظامِ باطل کے ردِّعمل کا پامردی سے مقابلہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا حکم اِن الفاظ میں دیا ہے:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں اُن سے جو تم سے لڑتے رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

قتال فی سبیل اللہ کا مقصد ہے اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور ہو جائے نظام کل کا کل اللہ کے لیے''۔

قتال فی سبیل اللہ' جہاد فی سبیل اللہ کی اعلیٰ ترین صورت ہے :

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ

مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾ (الصّف)

''بلا شبہ اللہ تو محبت کرتا ہے اُن سے جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں صف درصف (جم کر) گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

☆ قتال فی سبیل اللہ کے آغاز کے لیے شرائط :

- ایک امیر کی قیادت میں منظّم جماعت کا قیام عمل میں آچکا ہو۔
- جماعت میں شامل فدائین نے اپنے سیرت وکردار کا اثر قائم کر دیا ہو۔
- جماعت نے معاشرے میں دعوت پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہو۔
- اسباب کے حوالے سے فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔
- متحارب گروہ سے اگر کوئی معاہدہ ہے تو اُسے علی الاعلان ختم کر دیا گیا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ (الانفال)

''اور اگر تمہیں کسی قوم سے دغا بازی کا خوف ہو تو (اُن کا عہد) انہی کی طرف پھینک دو (اور) برابر (کا جواب دو)۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ دغا بازوں کو پسند نہیں فرماتا''۔

☆ جہاد فی سبیل اللہ کا اصل واوّلین میدان:

ہر نبی علیہ السلام کی سنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا اصل اور اوّلین میدان اپنا علاقہ ہوتا ہے۔ اگر وہاں غلبہ ٔ دین کی جدوجہد کرنا ممکن نہ رہے تب ایسی جگہ ہجرت کی جاسکتی ہے جہاں دین کی خدمت کرنا ممکن ہو۔

☆ قتال فی سبیل اللہ اور مسلم معاشرہ میں درپیش مشکلات:

- مقابلہ باطل نظام کے محافظ کلمہ گو مسلمانوں سے ہے۔ کلمہ گو مسلمان حکمرانوں سے تصادم کے لیے فقہاء نے دو شرائط بیان کی ہیں :

(i) حکمران کھلم کھلا کفر کا نفاذ کر رہے ہوں۔

(ii) مناسب اسباب کی اِس حد تک فراہمی کہ فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔

- موجودہ دور میں اسباب یعنی ہتھیاروں اور عسکری تربیت کے اعتبار سے حکومت اور

عوام میں بہت زیادہ عدم توازن ہے اور حکومت کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں فتح کا امکان محسوس نہیں ہوتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مشکلات کے پیشِ نظر موجودہ حالات میں دینِ حق کے غلبہ کے لیے متبادل طریقۂ کار کیا ہوگا؟ ان شاء اللہ اس سوال کا جواب ہم درس چار میں سمجھیں گے۔

☆ آیت ۱۲:

﴿یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ﴾ ''وہ تمہارے گناہ بخش دے گا''..... ﴿وَیُدۡخِلۡکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ ''اور داخل کرے گا تمہیں اُن باغات میں بہتی ہیں جن کے دامن میں نہریں'' ..... ﴿وَمَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ﴾ ''اور اُن پاکیزہ مکانات میں جو ہمیشہ رہنے والے باغات میں ہیں''..... ﴿ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۲﴾﴾ ''وہی ہے شاندار کامیابی''۔

آیت ۱۱ میں بیان شدہ تقاضوں کو ادا کرنے والوں کے لیے اِس آیت میں دو انعامات بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا انعام ہے گناہوں کی معافی اور دوسرا انعام ہے جنت کے پاکیزہ گھروں میں داخلہ۔ جنت اور اِس کے پاکیزہ گھروں کا جہاد فی سبیل اللہ سے ایک خاص تعلق ہے۔ اللہ کی راہ میں تن من دھن سے جدوجہد کرنے والے کے لیے یہاں گھر بنانے کی خاطر وسائل کی فراہمی اور وقت کا فارغ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا اپنا ایک اچھا سا گھر ہو۔ اگر اُسے کوئی پلاٹ مل جائے یا وہ خرید لے تو دوسروں کو خوشی کے ساتھ بتاتا ہے کہ میں نے پلاٹ لے لیا ہے۔ پھر وہ پائی پائی جوڑ کر مکان بناتا ہے۔ پھر اُس کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی جب وہ اُس گھر میں منتقل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد موت آتی ہے اور انسان کو اُس کی زندگی بھر کی کمائی کے حاصل سے جدا کر کے قبر کے تنگ اور ویران مقام پر لے جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اِس دنیا میں گھر کے حصول کی خواہش کو قربان کر کے اپنی توانائیاں اللہ کے دین کی خدمت کے لیے لگاتا ہے۔ اللہ اِس ایثار کی قدر افزائی فرماتے ہوئے وعدہ کر رہا ہے کہ وہ دین کے خادم کو آخرت میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ایسا گھر عطا فرمائے گا جس کی وسعت کا اندازہ لگانا یہاں ممکن نہیں۔ یہ گھر ہوگا بھی انتہائی پرفضا مقام پر یعنی گھنے باغات کے درمیان اور بہتی ہوئی شفاف نہروں کے اوپر۔ حقیقت میں دانشمند وہی لوگ ہیں جو ایسے گھر کے حصول کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کر دیں۔

اِس آیت میں مزید فرمایا گیا کہ: ﴿ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴾ یعنی آخرت کی کامیابی ہی

اصل کامیابی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾﴾ (الاعلیٰ)

''اور آخرت بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے''۔

بندۂ مؤمن کو دنیا کے نتائج سے لاتعلق ہوکر اپنی نگاہ آخرت کی کامیابی پر مرکوز کرنی چاہیے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد نے فتح مکہ سے قبل شہادت کی سعادت حاصل کی۔وہ دُنیوی فتح نہ دیکھ سکے' لیکن غلبۂ دین کی راہ میں جانیں نثار کر کے ہمیشہ ہمیش کی کامیابی سے فیض یاب ہو گئے۔جولوگ محض دُنیوی نتائج کے طلب گار ہوتے ہیں وہ اکثر مایوس کن حالات کی وجہ سے ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔فیضؔ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم — اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبح و شاموں کی — اب کے بھی اکارت جائے گی
دھرتی کے کونوں کھدروں میں — پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے — پھر اگلی رُت کی فکر کرو
پھر اگلی رُت کی فکر کرو — جب پھر اِک بار اُجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا — جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں دُنیوی نتائج کی پرواہ کیے بغیر' اپنی رضا اور اُخروی نعمتوں کے حصول کو مقصود بناتے ہوئے' زندگی کے آخری سانس تک اپنے دین کے غلبہ کے لیے مال و جان لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

حواشی

(٥) مسند احمد : ١٧٦٨٠۔
(٦) صحیح مسلم' کتاب الفتن و اشراط الساعة' باب هلاك هذه الامة بعضهم ببعض۔
(٧) مسند احمد:٢٢٦٩٧۔
(٨) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب منه۔
(٩) سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع' باب منه۔
(١٠) کنزالعمال ٢٦٩/٤۔ سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی:١٤٩٦۔

❁❁❁

جماعت سے جڑے رہنے کا حکم

عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَاِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَاِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ، مَنْ اَرَادَ بُحْبُوْحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ)) (سنن الترمذی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر جماعت کا التزام کرنا لازم ہے، اور یہ کہ جدا ہونے سے بچو۔ پس بے شک شیطان اکیلے شخص کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے نسبتاً زیادہ دُور ہوتا ہے۔ جو کوئی جنت کی خوشبو (کے حصول) کا طلب گار ہو پس وہ جماعت کے ساتھ جڑا رہے۔''

بیعت کی اہمیت

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ : ((مَنْ خَلَعَ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا حُجَّةَ لَهٗ وَمَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) (مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے سنا اللہ کے رسول ﷺ کو وہ فرما رہے تھے: ''جس نے امیر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ روزِ قیامت اللہ سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی، اور جو کوئی مر گیا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّی

عتیق الرحمٰن صدیقی

قرآن حکیم میں چند ایک مقامات ایسے ہیں جہاں حضور نبی کریم ﷺ کو اُمی کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور لفظ اُمّی کو آپ ﷺ کے خصائص میں شمار کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ جس قوم میں مبعوث ہوئے یعنی اہل عرب، اُسے بھی ''اُمیین'' کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہود کے ناخواندہ افراد کو بھی اُمی کہا گیا ہے۔ فرمایا:

☆ ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے''۔

☆ ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الاعراف)

''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، اُمید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے''۔

☆ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ﴾ (البقرۃ)

''اور ان میں ایک دوسرا گروہ اُمیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں''۔

☆ ﴿وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ﴾ (آل عمران:۲۰)

''اور اہل کتاب اور (عرب کے) اَن پڑھ لوگوں سے پوچھو کیا تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو؟''

☆ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ (آل عمران:۷۵)

''(ان لوگوں میں یہ بدمعاملگی) اس لیے پیدا ہوگئی کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمیوں سے معاملہ کرتے ہوئے (ہم جو کچھ بھی کریں) ہمارے لیے کوئی مؤاخذہ نہیں''۔

☆ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۫ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۪﴾ (الجمعة)

''وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے (ان کی زندگی سنوارتا ہے) اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے''۔

مذکورہ بالا مقامات پر دو دفعہ نبی اکرم ﷺ کو اُمی کے وصف سے متصف کیا گیا ہے' باقی جگہوں میں اُمیین اور اُمیّون کے الفاظ اہل کتاب کے ناخواندہ اشخاص کے لیے بھی استعمال ہوئے اور اہل عرب کو بھی اس نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل عرب کے لیے تو یہ نام معرفہ بن گیا تھا۔ قابل غور بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا۔ سیرت نگار کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ اس طرزِ خطاب سے خورسند اور مسرور ہوا کرتے تھے۔ آئیں اور پہلے اہل لغت سے پوچھیں کہ ''اُمی'' کے معنی کیا ہیں!

ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: ''الاُمّیّ الذی لا یکتُبُ'' یعنی اُمی وہ ہے جو لکھنا نہ جانے۔ پھر اور وضاحت کی کہ یہ لکھنا اکتسابی ہے۔ بعد ازاں حدیث سے سند پیش کرتے ہوئے یہ عبارت نقل کرتے ہیں: ((اِنَّا اُمَّـةٌ اُمِّیَّـةٌ لَا نَـكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ)) یعنی ''ہم اَن پڑھ لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب'' ((بُعِثْتُ اِلٰی اُمَّةٍ اُمِّیَّةٍ)) یعنی ''میں ایک ان پڑھ قوم میں مبعوث ہوا ہوں''۔ مزید لکھتے ہیں کہ عربوں کو اس لیے اُمی کہتے تھے کہ ان میں لکھنے کا رواج بڑا نادر تھا۔ وہ اپنی تائید میں الفاظ قرآنی: ﴿بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ پیش کرتے ہیں اور اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو بھی اُمی لقب سے یاد کیا جاتا ہے' کیونکہ عرب قوم لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ (وَبَعَثَهُ اللّٰهُ رَسُوْلًا وَهُوَ لَا یَكْتُبُ وَلَا یَقْرَءُ مِنْ كِتَابٍ)۔ وہ لکھتے ہیں البتہ تلاوتِ قرآن آپ ﷺ کا معجزہ تھا' جب بھی آپؐ تلاوت فرماتے نہ تو کبھی الفاظ کا ردّوبدل ہوتا اور نہ زیروزبر میں فرق آتا''۔ (لسان العرب)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''الاُمّی وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو' چنانچہ آیت کریمہ ''وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے (محمد ﷺ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا'' (الجمعۃ) میں اُمیین سے یہی مراد ہے۔ قطرب نے کہا ہے کہ اُمَّیَّۃٌ بمعنی غفلت اور جہالت کے ہیں اور اسی سے اُمی ہے' کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی' چنانچہ فرمایا: ''بعض ان میں سے اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں''۔ (البقرۃ) بعض نے کہا ہے کہ اُمِّیٌّ اس اُمت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو' جس طرح عَامِیٌّ اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اُمی کہنا اس بنا پر ہے کہ آپؐ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے' بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور خدا کی اس ضمانت پر کہ ﴿سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی﴾ (الاعلیٰ) ''ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے'' اعتماد کرتے تھے۔ یہ صفت آپ ﷺ کے لیے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ اُمّ القریٰ یعنی مکہ کی طرف نسبت ہے''۔ (مفردات القرآن)

قدیم مفسر ابن جریر طبری اپنی تفسیر جامع البیان میں لکھتے ہیں: '' اُمِّیُّوْنَ وہ ہیں جو نہ لکھ سکیں نہ پڑھ سکیں''۔ (جلد۲' صفحہ ۲۵۷) مزید لکھتے ہیں کہ ''عربوں کے نزدیک اُمِّی وہ شخص ہے جو لکھنا نہ جانتا ہو''۔ (صفحہ ۲۵۹) عالی مرتبہ مفسر زمخشری لکھتے ہیں ''اُمی کی نسبت عربوں کی طرف ہے' کیونکہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے'' (تفسیر کشاف' جلد۴)۔ شہرۂ آفاق مفسر قرآن قرطبی اپنی تفسیر میں وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ (البقرۃ: ۷۸) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یعنی اُمی وہ جو نہ پڑھ سکے اور نہ لکھ سکے۔ اُمی کا لفظ اَن پڑھ لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ اُمی وہ لوگ ہیں جو اس حالت پر ہوں جس حالت میں ماؤں نے انہیں جنم دیا' انہوں نے نہ لکھنا سیکھا نہ پڑھنا'' (تفسیر قرطبی' جلد۲)۔ امام بیضاوی اپنی معروف تفسیر میں سورۃ الجمعہ کی آیت کی توضیح یوں کرتے ہیں ''یعنی اللہ نے آنحضرت ﷺ کو عربوں میں مبعوث فرمایا' کیونکہ ان کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی''۔ تفسیر خازن میں اسی آیت کے ضمن میں فاضل مفسر رقمطراز ہیں ''اللہ نے حضور نبی کریم ﷺ کو عربوں میں مبعوث فرمایا' عرب اَن پڑھ قوم تھی' نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ اُمی ماں کی طرف منسوب ہے۔ اُمّی وہ ہے جو پیدائشی صلاحیتوں اور خصلتوں پر قانع رہے''۔

❁ دورِ حاضر کے مشہور مفسر علامہ مراغی فرماتے ہیں:

''اُمی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے..... ایک اُمی آدمی جو نہ لکھ سکے نہ پڑھ سکے اور کوئی علم بھی حاصل نہ کیا ہو اور عمر بھر کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہہ نہ کیا ہو ایسا اُمی ایسے حکم احکام لائے تو اس کی نبوت میں کون اور کیونکر شک کر سکتا ہے؟'' (المراغی' بحوالہ اُمی نبی کا مفہوم' نقوش' سیرت نمبر' جلد چہارم)

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''عربی میں اُمی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔ لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہوا ہو۔ چنانچہ عرب کے باشندے بھی اُمّی کہلائے' کیونکہ تعلیم و تربیت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ پیغمبر اسلام کو الاُمی اس لیے فرمایا کیونکہ ظاہری تعلیم و تربیت کا اُن پر سایہ بھی نہ پڑا تھا' جو کچھ تھا سرچشمۂ وحی کا فیضان تھا۔ چونکہ تورات کی بشارات میں پیغمبر موعود کے اس وصف کی طرف اشارہ تھا اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا''۔ (ترجمان القرآن' جلد دوم)

❁ سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا..... ﴾ کی توضیح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں اُمی کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں' بلکہ مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا۔ کہیں اہل کتاب کے مقابلہ میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہیں۔ مثلاً فرمایا: ''اہل کتاب اور اُمیوں سے پوچھو کیا تم نے اسلام قبول کیا؟'' (آل عمران: ۲۰)۔ یہاں اُمیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں..... کسی جگہ یہ لفظ خود اہل کتاب کے اَن پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے فرمایا: ''ان یہودیوں میں کچھ لوگ اُمی ہیں کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے' بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں'' (البقرۃ: ۷۸)۔ کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں' مثلاً فرمایا: ''ان کے اندر یہ بددیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اُمیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے'' (آل عمران: ۷۵) ..... دراصل عبرانی زبان کا لفظ ''گوئیم'' ابتداءً محض اقوام کے معنی میں بولا جاتا تھا' لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کے لیے مخصوص کر دیا' پھر اس کے اندر یہ معنی پیدا کر دیے کہ یہودیوں کے سوا تمام اقوام ناشائستہ' بدمذہب'

ناپاک اور ذلیل ہیں، حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح Barbarian سے بھی بازی لے گیا جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لیے استعمال کرتے تھے''۔(تفہیم القرآن، جلد پنجم)

❁ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''یہاں نبی ﷺ کے لیے اُمی کا لفظ بہت معنی خیز استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو اُمی (Gentiles) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر وغرور کسی اُمی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمیوں کے لیے اپنے برابر اسلامی حقوق ہی تسلیم کر لیں..... پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی اُمی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو''۔(تفہیم القرآن، جلد دوم)

❁ مولانا امین احسن اصلاحی سورۂ آل عمران کی آیت ۲۰ کے تحت اُمی کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

''اُمّی مدرسی و کتابی تعلیم و تعلّم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ اُمیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل جو حامل کتاب تھے اُمّیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی..... لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے کوئی تحقیر کا پہلو موجود نہ تھا، چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے ممیّز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت ﷺ کے لیے نبی اُمی کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں توریت کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے''۔(تدبر قرآن، جلد دوم)

پھر سورۃ الاعراف میں الاُمی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''قرآن نے اس لفظ کو ان کے لیے بطور ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہ بھی اس کو بلا کسی احساسِ کہتری کے استعمال کرتے تھے۔ گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لیے یہ ایک امتیازی لقب تھا''۔(تدبر قرآن، جلد سوم)

۞ علامہ سید محمود آلوسی تحریر فرماتے ہیں:

''حضور ﷺ کو اُمی مبعوث کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جب کسی کے سینے کو علوم و معارف سے لبریز کرتا ہے تو اسے تحصیل علم کے مروّجہ طریقوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ (**اشارة الی عظیم قدرته عزوجل وان افاضة العلوم لا تتوقف علی الاسباب العادیة**) ..... حضور ﷺ کو اُمی مبعوث کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ کوئی شخص حضور ﷺ پر الزام نہ لگا سکے کہ جو حکیمانہ کلمات اور پاکیزہ تعلیمات آپ سکھا رہے ہیں وہ حکماء کی کتابوں کے طویل اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ جب اہل نظر دیکھیں گے کہ اس ہستی نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا' کبھی نہ کچھ لکھا اور نہ کچھ پڑھا' پھر جو حکیمانہ کلام آپؐ سناتے ہیں یہ آپؐ کا کلام نہیں بلکہ ربّ العالمین کا کلام ہے''۔ (ضیاء القرآن' جلد پنجم)

۞ مفتی محمد شفیعؒ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''**الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّی** اس جگہ رسول اور نبی کے دو لقبوں کے ساتھ آپ ﷺ کی ایک تیسری صفت اُمی بھی بیان کی گئی ہے۔ اُمی کے لفظی معنی اَن پڑھ کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ عام قوم عرب کو قرآن میں اُمیین اس لیے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اور اُمی ہونا کسی انسان کے لیے کوئی صفت مدح نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے' مگر رسول کریم ﷺ کے علوم و معارف اور خصوصیات اور حالات و کمالات کے ساتھ اُمی ہونا آپؐ کے لیے بڑی صفت کمال بن گئی ہے۔ کیونکہ اگر علمی' عملی' اخلاقی حالات و کمالات کسی پڑھے لکھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک اُمی محض سے ایسے بیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق و معارف کا صدور ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند و مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جبکہ آپ ﷺ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا' ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکایک آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر وہ کلام جاری ہوا' جس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہو گئی۔ تو ان حالات میں آپ ﷺ کا اُمی ہونا آپؐ کے رسول من جانب اللہ ہونے اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر بہت بڑی شہادت ہے۔ اس لیے اُمی ہونا اگرچہ دوسروں کے لیے صفت مدح نہیں' مگر رسول اللہ ﷺ کے لیے بہت بڑی صفت مدح و کمال ہے۔ جیسے متکبر کا لفظ

عام انسانوں کے لیے صفت مدح نہیں بلکہ عیب ہے، مگر حق تعالیٰ کے لیے خصوصیت سے صفت مدح ہے''۔ (معارف القرآن، جلد چہارم)

❁ صاحب ''رحمۃٌ للعالمین'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری ''النَّبِیَّ الْاُمِّیّ'' کو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''(ا) یہ محقق ہے کہ سیدنا و مولانا محمد المصطفیٰ ﷺ کے سوا الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیّ اور کسی نبی کا لقب نہ تھا۔ حضور ﷺ کا یہی لقب انبیاء کرام f کو اور سابقہ اُمم کو بتلایا گیا ہے۔

(ب) اُمّی اُمّ القریٰ کی نسبت سے ہے ﴿وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (الانعام: ۹۲) ''کہ تو اُمّ القریٰ کو اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو ڈرائے۔'' تاریخ اور روایت کے مجموعی اتفاق سے ثابت ہے کہ مکہ اُمّ القریٰ ہے۔

(ج) اسم اُمّی، اُم کی طرف منسوب ہے اس اعتبار سے کہ نبی ﷺ بوجہ پاکیٔ فطرت و عصمت، منجانب ربّ العزت جملہ عیوب و نقائص سے ایسے ہی پاک و صاف ہیں جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ ہوتا ہے۔

(د) 'اُمّی' اُمّ کی طرف منسوب ہے اس اعتبار سے کہ حضور ﷺ نے ولادت کے بعد اکتساب علوم و فنون کی جانب کوئی رغبت نہ کی تھی اور حضور ﷺ کی لوحِ قلب پر تقریراً یا تحریراً کسی ایک حرف کا نقش ثابت نہ ہوا تھا۔ ملک عرب کی حالت بھی یہی تھی کہ وہ لکھنے پڑھنے سے عاری ہوتے تھے، وہ اپنی تمام عمر اسی حالت میں پوری کر دیا کرتے جو ایک ایسے بچے کی ہوتی ہے جو نہ مکتب گیا، نہ درس لیا، نہ قلم ہاتھ میں پکڑا، نہ سبق زبان پر جاری ہوا۔

(ہ) النَّبِیَّ الْاُمِّی کے وصف نے بتلا دیا کہ حضور ﷺ حرف شناسی و خط کشی سے تو دور ہیں اور بایں ہمہ علوم عظیمہ و آیات کاملہ کا صدور حضور ﷺ سے برابر ہوتا رہا۔

(و) لقب الْاُمِّی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اوّل الانبیاء ابوالبشر آدم d سے لے کر آخر الانبیاء بنی اسرائیل عبداللہ عیسیٰ ابن مریم تک جملہ انبیاء و مرسلین نے حضور ﷺ کے نعوت عالیہ اور اوصافِ جلیّہ بیان کیے۔ الف سے آدم، میم سے مسیح مراد ہے اور یائے نسبت اسی راز کی کاشف ہے ؎

اُمی و گویا بزبان فصیح از الف آدم و میم مسیح''۔ (رحمۃٌ للعالمین، حصہ سوم)

مندرجہ بالا سطور میں کی گئی بحث کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ:

☆ اُمی یا تو اُم (بمعنی والدہ) کی طرف منسوب ہے یا اُمّ القریٰ کی طرف جس سے مراد مکہ مکرمہ ہے' مگر اس کے معروف معنی جو علمائے لغت اور قدیم و جدید مفسرین نے بیان کیے ہیں' ایک ایسے شخص کے ہیں جو لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہوا ہو اور اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔

☆ عربوں کو اُمی اس لیے کہا گیا کہ وہ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے آگاہ نہ تھے اور اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے۔

☆ یہودی اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے اور حقارت و نفرت کے طور پر عربوں کو اُمی کہتے تھے' گویا وہ ان کے نزدیک جاہل' گنوار اور ناشائستہ لوگ تھے۔

☆ عرب اپنے لیے اُمی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کوئی خفت محسوس نہ کرتے تھے' بلکہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل سے ممیّز کرنے کے لیے اُمی کہلانا پسند کرتے تھے۔

☆ حضور نبی کریم ﷺ کو اس لیے اُمی کہا گیا کہ انہوں نے ساری عمر کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا تھا' مگر اس کے باوجود وہ وحی کے فیضان سے منتہائے کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا انہوں نے افاضہ فرمایا وہ کسی مخلوق کے بس کا روگ نہ تھا۔ گویا نبیٔ اُمی کا لقب آپ ﷺ کے لیے باعث صد افتخار تھا۔

☆ حضور نبی کریم ﷺ کی اُمّیت اپنی معنویت کے تناظر میں متعدد حکمتوں کی حامل ہے۔ ہر اس چیز کو 'اُم' کہا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو۔ اللہ نے آپ ﷺ پر قرآن نازل کیا جو بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ ایک معجز نما کلام کا ایک اُمی کی زبان سے اظہار بجائے خود نبوت پر ایک محکم دلیل ہے۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ جن و انس کی اصلاح و تربیت کا واحد وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اگر اس سے مراد اُمّ القریٰ یعنی شہر مکہ ہو تو تفسیر مدارک کے مطابق ''یہ زمین کی ناف (وسط) ہے اور تمام بستیوں کا قبلہ ہے''۔ اللہ نے نہ صرف اس شہر خوباں کو اپنے نبی مکرم ﷺ کی ولادت کے لیے منتخب فرمایا بلکہ دین حق کے فروغ کے لیے بیت اللہ کو نوعِ انسانی کے قلب و نگاہ کا مرکز بنایا۔ یہ محور و مرکز اُمت مسلمہ کی وحدت اور ان کے مابین محبت و الفت کا نقیب ہے اور یہی کتاب و حکمت کی تعلیم کا منبع و مصدر ہے۔

☆ انسان کو بہت سی باتیں حواس کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں' حواسِ خمسہ کو ''گیٹس آف

نالج'' سے تعبیر کیا گیا ہے (قوت باصرہ' سامعہ' شامہ' لامسہ اور ذائقہ)۔ عقل بھی اپنی جولانیاں دکھاتی ہے' مگر زندگی اور کائنات کے بے شمار حقائق ایسے ہیں کہ ان تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ ریاضتِ نفس کی بڑی سے بڑی کوشش بھی کوئی کارکردگی دکھانے سے قاصر رہتی ہے۔ اجتماعی غور وفکر راہوں میں دم توڑ دیتا ہے' فطرت کی ودیعت کردہ روشنی بھی خیر وشر کی تعیین نہیں کر پاتی' تجربہ اور مشاہدہ بھی صراطِ مستقیم کی نشان دہی نہیں کر پاتا' اس کی فکری وجدانی قوتیں اللہ کی مرضیات معلوم کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑتا' اس کی رحمت مقتضی ہوتی ہے کہ وہ بندوں کی رہنمائی کا محفوظ انتظام کرے' یہی اہتمام وانصرام دین کی اصطلاح میں رسالت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر وحی نازل فرماتا ہے۔ اپنے چنیدہ بندوں کی رہنمائی خود کرتا ہے' اس میں اکتساب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لکھنا پڑھنا تو ایک آرٹ ہے' علم نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۞ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾

(العنکبوت:۴۸'۴۹)

''اور (اے نبی) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے' اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔''

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ﴾ (الرحمٰن) کے مصداق اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی' کسی مخلوق سے انہوں نے نہ کچھ پڑھا اور نہ سیکھا' یہ فیضانِ سماوی کا کرشمہ تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) ''بے شک میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ چنانچہ آپ ﷺ محاسنِ اخلاق اور محامد اعمال کے نقطۂ عروج پر فائز تھے۔ صاحب رحمۃٌ للعالمین کے الفاظ میں:

''تدبیر منزل' سیاست مدن' اقتصادیات' سیاسیات' عمرانیات کے درس اور دماغ کو روشن' قلب کو مجلیٰ' روح کو منور بنانے والی تعلیم آپ ﷺ نے دی''۔

آپ ﷺ نے ایک اَن پڑھ قوم کو بے شمار علوم کا حامل بنا دیا۔ تہذیب وثقافت اور علم وادب کو

ایک نئی انقلاب آفریں جہت عطا کی۔ اُمی محض ہونے کے باوجود ایسا کلام پیش کیا کہ عرب کے بڑے بڑے خطیب اور شاعر اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گئے۔ بے نظیر حقائق و معارف کی تعلیم دینا بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔

اخذ واستفادہ

(۱) مفردات القرآن، از راغب اصفہانی (۲) تفہیم القرآن، جلد اول، دوم، پنجم
(۳) تدبر قرآن، جلد دوم وسوم (۴) ضیاء القرآن، جلد پنجم
(۵) تفسیر عثمانی (۶) معارف القرآن، جلد چہارم
(۷) ترجمان القرآن، جلد دوم از ابوالکلام آزاد
(۸) اُمی نبی کا مفہوم، از پروفیسر عبدالقیوم، نقوش سیرت نمبر، جلد چہارم۔
(۹) لسان العرب (بحوالہ نقوش سیرت نمبر)
(۱۰) رحمۃٌ للعالمین، از قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اتحاد بین المسلمین

ڈاکٹر ابو معاذ کی کتاب کے حوالے سے ایک سوال،

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا جواب

اور ڈاکٹر ابو معاذ کی وضاحت

بخدمت جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے ادارہ ''خدام القرآن'' سے شائع ہونے والی گراں قدر تصنیف ''اہل فارس کی فکری وعملی میراث اور علامہ اقبال'' مصنفہ ڈاکٹر ابو معاذ صاحب پڑھنے کا اتفاق ہوا اور سبیل یوں بنی کہ راقم کے بڑے بھائی طارق عزیز نے جناب والا کی امامت میں جمعہ ادا کیا اور آپ نے اپنے خطبہ میں کتاب مذکورہ خرید کر مطالعہ کرنے پر زور دیا۔ آپ کی شخصیت اور مقام کے پیش نظر اس کتاب کی تائید وتصدیق سن کر میرے برادرِ کبیر نے بھی کتاب خریدی اور ان کے ذریعے پھر مجھے بھی بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ خزائن علمی میں اضافہ دیکھ کر قلبی تسکین ہوئی۔ مصنف کے قلم کا بانکپن اور از اول تا آخر متانت وسنجیدگی نے بھی متأثر کیا۔ تاہم ایک بات سے کوشش کے باوجود بھی اتفاق نہ کر سکا۔ اسی ایک عبارت کی توضیح کی خاطر خامہ فرسائی کی جسارت کی ہے، اُمید ہے آپ اپنے قیمتی وقت میں ان سطورِ منتشرہ کو بھی درخورِ اعتناء سمجھ کر تشفی فرمائیں گے۔ کتاب ہٰذا کے صفحہ نمبر ۴۰۳ پر یہ عبارت ہے:

> ''مغلوں کے زوال کے زمانے میں برصغیر میں شیعہ سنی اختلافات سر اٹھانے لگے اور نوبت کھلی جھڑپوں اور ایک دوسرے کی تکذیب اور تکفیر تک آن پہنچی۔ اس مکدر فضا کو ختم کرنے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ پیش پیش تھے، جنہوں نے شیعوں کو اسلام کا فرقہ قرار دے کر انہیں اُمت مسلمہ کا جزو قرار دیا.....الخ''

جناب ڈاکٹر صاحب!

اس عبارت کے آگے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا' بلکہ پوری کتاب میں کہیں بھی اصل ماخذ کی طرف راہنمائی نہیں کی گئی۔ بہر کیف جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا رافضیت کو جزوِ اسلام قرار دینے کا تعلق ہے یہ مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطبوعہ ''وصیت نامہ'' موجود ہے' جو کہ فارسی میں ہے اور مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا ہے۔ اس کے صفحہ ۹ پر ہے:

''ایں فقیر از روح پر فتوح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرد کہ حضرت چہ می فرمایند در باب شیعہ کہ مدعی اہل بیت اند وصحابہ رضی اللہ عنہم را بدی می گویند۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنوعی از کلام روحانی القاء فرمودند کہ مذہب ایشاں باطل است' و بطلان مذہب ایشاں از لفظ امام معلوم می شود۔ چوں ازاں حالت افاقت دست داد' در لفظ امام تامل کردم' معلوم شد کہ امام باصطلاح ایشاں معصوم مفروض الطاعۃ منصوب للخلق است' و وحی باطنی در حق امام تجویز می نمایند۔ پس در حقیقت ختم نبوت را منکرند' گو بزبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را خاتم الانبیاء می گفتہ باشد......الخ'' (وصیت نامہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ' ص۹' طبع دہلی)

''(ترجمہ) اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح سے سوال کیا کہ شیعہ اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہتے ہیں' ان کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلامِ روحانی سے القاء فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور بطلان ان کے مذہب کا لفظ امام سے معلوم ہوتا ہے۔ جب فقیر کو اس حالت سے افاقہ ہوا تو لفظ امام پر غور کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی اصطلاح میں اسے امام کہتے ہیں جو معصوم' مفروض الطاعۃ اور منصوب للخلق ہو' اور یہ امام کے حق میں وحی باطنی تجویز کرتے ہیں۔ پس یہ ختم نبوت کے در حقیقت منکر ہیں' اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان سے خاتم الانبیاء بھی کہتے ہیں......الخ''۔

جناب محترم!

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''**قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین**'' اور ''**اِزالۃ الخفاء**'' کے نام سے باقاعدہ کتب لکھیں' جن میں شیعہ مذہب پر جرح کی گئی ہے۔ اور انہی کی بنیاد پر آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ نے معرکۃ الآراء کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' لکھی' جو آج تک علمی حلقوں میں اپنا لوہا منوا رہی ہے اور شیعہ علماء بھی اس کی گرفت سے آج

تک اپنی کلائی چھڑا نہیں سکے۔ بہرحال خاندان ولی اللہ کل کا کل مذہب شیعہ کو اسلام کے برعکس ایک الگ مذہب گردانتا رہا اور ان کا علمی تعاقب کرتا رہا۔

کتاب ''اہل فارس کی فکری و عملی میراث'' کے قابل احترام مصنف نے شیعیت کو تاریخی طور پر دیکھا ہے' شاید ان کے نظریات و عقائد کی طرف مراجعت نہیں کی۔ لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کا تفصیلی جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔ راقم الحروف ماہنامہ ''میثاق'' کا باقاعدہ قاری بھی ہے۔ اگر میری یہ معروضات اور آپ کا جواب ''میثاق'' کے صفحات کی زینت بن جائے تو شاید متلاشیانِ حق اور تشنگانِ علم کو ایک نئی لذت دے سکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام
عبدالجبار سلفی
سبزہ زار سکیم' ملتان روڈ' لاہور

جواب از ڈاکٹر اسرار احمد

۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور ۲/ جولائی ۲۰۰۸ء

محترمی مولانا زید لطفکم' ——— وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید ہے کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ جمیع احباب و متعلقین سمیت جسمانی اور روحانی ہر دو اعتبار سے بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا ایک مکتوب (تاریخ درج نہیں ہے) کچھ عرصہ قبل موصول ہوا تھا۔ جواب میں تاخیر ہوگئی ہے' جس کے لیے معذرت خواہ ہوں!

آپ نے اپنا جو تأثر اور اختلاف تحریر فرمایا ہے' ابومعاذ صاحب کی کتاب میں ظاہر شدہ آراء سے مجھے بھی اگر ''اختلاف'' نہیں تو حیرانی ضرور ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں بات ذہن سے اُتر گئی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس مسئلے کو ذہن میں تازہ کر دیا۔

میں اگرچہ نہ علومِ دینیہ کا فاضل ہوں نہ تاریخ کا محقق (بلکہ صرف قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں' اور زیادہ سے زیادہ اس کا حقیر سا ''مبلغ'') ——— تاہم بعض فلسفیانہ اور تاریخی

مباحث پر اب سے لگ بھگ تیس سال قبل غور وفکر کر کے کچھ نتائج تک پہنچ گیا تھا' لیکن اس کے بعد دعوتی اور تنظیمی مسائل میں مصروفیت کی بنا پر ان امور کی جانب توجہ نہیں رہی!

اپنے اُس وقت کے مطالعے اور تفتیش کے ذریعے آپ کے چھیڑے ہوئے مسئلے کے ضمن میں جو باتیں حاصلِ مطالعہ کے طور پر میرے ذہن میں موجود ہیں' وہ درج ذیل ہیں:

(اگرچہ ان کے ضمن میں حوالہ جات میں اس وقت پیش نہیں کر سکتا!)

۱۔ روافض اور اہل تشیع کے ضمن میں تنقید اور تردید کی جو شدت امامِ ربانی مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے یہاں پائی جاتی ہے ـــــ وہ بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے یہاں نہیں ہے!

۲۔ حضرت مجددؒ شد ومدّ کے ساتھ خلفاءِ اربعہ کے مابین ترتیب فضیلت ترتیبِ خلافت کے مطابق بیان کرتے ہیں' جبکہ شاہ صاحبؒ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے ہیں (جس پر ان کی مایۂ ناز تالیف ''**قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ**'' گواہ ہے!) لیکن غالباً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علیؓ سے افضل نہیں مانتے ـــــ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کسی مقام پر انہوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ: ''اگر میری طبیعت کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ تفضیل علیؓ کی جانب رجحان رکھتی ہے لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ میں فضیلتِ شیخین کو تسلیم کروں!ـــــ گویا یہاں بھی حضرت عثمانؓ کے ضمن میں سکوت ہے!

۳۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں شاہ صاحب کا یہ قول بھی کبھی پڑھنے یا سننے میں آیا تھا کہ ان کی رائے میں حضرت علیؓ اپنی ذات میں تو خلیفۂ راشد تھے' لیکن چونکہ ان کی خلافت کی writ پورے عالم اسلام پر قائم و نافذ نہیں ہو سکی لہٰذا ان کا دورِ خلافت ''خلافت راشدہ'' میں شامل نہیں ہے!ـــــ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں اس معاملے میں بھی اپنی طبیعت کے عام رجحان یعنی ''جمع بین الاضداد'' اور ''توفیق بین المذاہب'' کی صورت موجود ہے' واللہ اعلم!

بہرحال میں نے محترم ڈاکٹر ابومعاذ صاحب سے بھی مفصل بات کی ہےـــــ وہ ان شاء اللہ جلد ہی اس معاملے میں اپنی آراء کی مفصل وضاحت کریں گے' جو 'میثاق' میں شائع کر دی جائے گی۔ فقط **والسّلام علیکم وعلٰی من لدیکم'**

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

وضاحت از ڈاکٹر ابو معاذ

یہ امر بندۂ ناچیز کے لیے باعث سعادت ہے کہ اس کے خیالات اہل علم کے ہاں بحث و تمحیص کا موضوع بنے ہیں اور ایک بار پھر مجھے یہ موقع ملا ہے کہ ان پر کچھ کہا جائے۔ قابل احترام مولانا عبدالجبار سلفی دامت برکاتہٗ نے محترم ومکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمت میں اس موضوع پر مراسلہ بھیجا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے جوابی خط میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ محسوس یوں ہو رہا ہے کہ ہم تینوں میں فکری ہم آہنگی موجود ہے، مگر علمی تشنگی کے باعث ہم سب حیرت واستعجاب کے مرحلہ سے گزر رہے ہیں۔ بقول عرفی شیرازی: ؎

با کہ گویم سرّ ایں معنی کہ نورِ روئے دوست
در دماغِ من گل و در چشمِ موسیٰؑ آتش است

(میں اس معنی کا راز کس کس کو بتاؤں کہ محبوب کے چہرے کا نور میری سوچ کے مطابق پھول کی رنگینی میں جھلک رہا ہے، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہوں میں وہ کوہِ طور پر جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔)

اس مقام پر عقائد کے بارے میں بحث سے گریز ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خیالات کی بابت جو کچھ فرمایا مجھے آپ کے خط کے مندرجات سے اتفاق ہے، ہاں خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موضوع پر شاہ صاحبؒ کے خیالات حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''المنتقیٰ'' کے مندرجات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کوئی تیس برس قبل میں نے کیا تھا اور قریب قریب یہی الفاظ وہاں بھی درج تھے۔ مگر ان خیالات سے ہم تینوں میں سے ایک بھی متفق نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک نازک سیاسی اور قانونی مسئلہ ہے، مگر یہ مسئلہ عقائد اور جذبات کی شدت کا موضوع بھی بن سکتا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صداقت اور آپ کے عظیم مقام پر ہم سب متفق ہیں اور اس پر کسی قسم کی بحث ایک لاحاصل موضوع ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا عہد بذاتِ خود مغلیہ عہد کے شباب کا زمانہ ہے جہاں اکبر کے دینِ الٰہی کے گہرے اثرات اور ''ہندوانہ تصورات'' کے فروغ کے باعث جناب احمد سرہندیؒ جیسے جلیل القدر شخص کا برہم ہونا ایک فطری امر تھا۔ دوسری جانب اکبر و جہانگیر کے عہد میں دو تہائی اعلیٰ عہدیدارانِ حکومت بشمول انتظامی، فوجی اور مالیاتی محکموں کے سرکردہ حضرات

ایران یا وسطی ایشیاء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی مادری زبان فارسی تھی' ایرانی عمائدین کا امور سلطنت پر مکمل کنٹرول تھا اور مقامی مسلمان ان کے مالی اور سیاسی استحکام پر نالاں تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر شیعہ تھے اور عوام الناس اس معاملہ میں کبھی کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ سندیلوی کے اورنگزیب عالمگیر کے خطوط کے مجموعہ میں ہمیں ۱۴ نمبر پر ایک خط ملتا ہے جو ایک عہدیدار محمد امین کے نام ہے۔ موصوف نے بادشاہ کو لکھا تھا کہ فوجی' انتظامی اور خصوصاً مالیاتی عہدوں پر بدعقیدہ غیر ملکی لوگ تعینات ہیں جنہیں اب ہٹا کر ہم جیسے پرانے نمک خواروں کو موقع دینے کا وقت آ گیا ہے۔ جواب میں بادشاہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کی مراد ایرانی شیعہ عہدیداروں سے ہے تو جہاں تک ان کے عقیدہ کا تعلق ہے تو لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے مصداق وہ ان کا اپنا معاملہ ہے اور ان کے عقائد کا کوئی تعلق ان کی سرکاری خدمات سے نہیں ہے۔ حضرت ہمایوں کے عہد سے اب تک جس جنگی مہم پر بھی ان کو بھیجا گیا ہے وہ وہاں سے سرخرو ہو کر واپس آئے ہیں اور کہیں بھی پیچھا نہیں دکھایا۔ انتظامی اور مالیاتی امور میں بھی ان جیسا کوئی اور گروہ نہیں ہے۔ ان کی فقط ایک ہی کمزوری ہے کہ وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور پروٹوکول کا خاص خیال رکھتے اور بہت زیادہ عزت و احترام کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان کی خدمات کے صلہ میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پھر مکتوب الیہ کو سرزنش کرتے ہوئے بادشاہ نے لکھا ہے کہ اگر آپ کی مغلیہ بادشاہت کے لیے شاندار سابقہ خدمت کا پاس نہ ہوتا تو میں اس گستاخی پر آپ کو اس کی سزا دیتا۔

خود اورنگ زیب کے ننہالی رشتہ دار اور والدہ ایرانی تھے۔ شاہ نے ان کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ بنگال کا گورنر بادشاہ کا ماموں (آصف خان کا بیٹا) تھا۔ یہ لوگ اپنے مخصوص کوارٹرز میں طمطراق اور جاہ و حشمت سے زندگی گزار رہے تھے اور اپنے عقائد پر آزادانہ کاربند تھے۔ عوام کی نظروں میں یہ لوگ کھٹکتے ضرور تھے اور مقامی ہندوستانی عمال ان سے کم درجہ کی مراعات کے باعث اور نسبتاً سادہ زندگی گزارنے کی وجہ سے کسی حد تک ان سے نالاں تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر تک معاملات کو حکمت عملی اور سرکاری سرپرستی کے باعث بخیر و خوبی سنبھالا دیا گیا' مگر مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی یہ مناقشات کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئے اور باہم شیر و شکر ہونے کی بجائے مسلمانوں کے دو گروہوں میں تصادم کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ ایرانی الاصل اور شیعہ حضرات اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر پشتہا پشت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وہ مالی طور پر مستحکم تھے اور اب مسلمان اشراف کے روپ میں سامنے آ گئے تھے'

کئی مقامی ریاستوں کے والی بھی تھے اور یہ لوگ اپنے اثر و رسوخ کے باعث بہتر اور مستحکم پوزیشن کے حامل تھے۔ مقامی ہندوستانی مسلمان زیادہ تر سنی العقیدہ تھے اور صوفیاء کرام کے زیر اثر تھے، وہ اس صورت حال پر غیر مطمئن دکھائی دیتے تھے اور ہر قسم کے اختلافی معاملہ پر دلگیر بھی تھے، جس کا اظہار مقامی ہندوستانی مسلمان عمائدین نے تحریری طور پر بھی کیا ہے، لیکن اورنگ زیب عالمگیر تک تمام بادشاہوں نے اس امر کی حوصلہ شکنی کی ہے اور ایرانی عمائدین کی حکومتی معاملات پر گرفت قائم رہی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بالآخر جہانگیر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ایک عرصہ اس کی چھاؤنیوں اور خیموں کے شہر میں مقیم رہتے ہیں، مگر یہ اثر و رسوخ قائم و دائم رہتا ہے۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد ایرانی عمائدین کی ہندوستان آمد کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ آگرہ کے دارالسلطنت میں مقیم ایرانی عمائدین مختلف ریاستی مراکز یعنی صوبوں کی راہ لیتے ہیں اور وہاں پر خود مختار ہو جاتے ہیں۔ اَوَدھ اور دکن کے علاوہ بنگال اور دیگر ریاستوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اب اس اہم تاریخی مقام پر ہندوستانی مسلمان اور ایرانی عمائدین کے درمیان ایک کشیدگی کی فضا سامنے آتی ہے جب ایرانی عمائدین کی سرپرستی کے لیے شہنشاہ کی ذات بھی موجود نہیں ہے اور مغلیہ سلطنت کا مرکز بھی ان کی پشت پناہی کے لیے موجود نہیں ہے۔ یہ وہ پہلا موقع ہے جب بدقسمتی سے شیعہ سنی اختلافات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب ہندوستان کے مسلمان بدبختی اور زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نظر آتے ہیں جو علم و دانش اور تدبر کے باعث تمام مشکلات کو بھانپ لیتے ہیں۔ عوام میں ان کے احترام کے باعث ان کو شاہ کا خطاب حاصل ہے۔ آپ سید نہ ہوتے ہوئے بھی شاہ کہلواتے ہیں، آپ کی نبض تاریخ کی دھڑکن پر ہے اور آپ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے آنکھ نہ کھولی تو وہ ایک خوفناک انجام سے بچ نہیں پائیں گے۔ مرہٹوں کی پیش قدمی، سکھوں کی پے در پے کامیابی، انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام کا بڑھتا ہوا اثر اور مسلمانوں کا علمی، عملی اور فکری جمود اپنے عروج پر ہے۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں شاہ صاحبؒ جیسا باشعور انسان شیعہ سنی اختلافات کو ایک زہر قاتل تصور کرتا ہے۔ آپ کے اپنے جذبات کچھ بھی ہوں آپ نے اُمت کو افتراق سے بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔

مجھے یہاں کسی بحث اور تحقیق کی اس لیے ضرورت درپیش نہیں ہے کہ اس موضوع پر عظیم

مؤرخ اور محقق جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے سیر حاصل بحث فرمائی ہے اور میں نے کتاب میں اپنے معروضات کی تدوین کے لیے انہی کی تحریروں سے استنباط کیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم قیامِ پاکستان سے قبل دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ آپ پاکستان کے پہلے وزیرِ تعلیم بنے۔ ایک عظیم سکالر وزیرِ تعلیم کے طور پر آپ ایران گئے تو وہاں کے اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ ایک عظیم علمی محقق وزیرِ تعلیم کا ذکر کیا۔ آپ کراچی یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر تھے۔ مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن کی تقریب رونمائی میں آپ کو مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے بطور صدر پاکستان اساتذہ کی کانفرنس منعقد کی تو اجلاس کی کارروائی شروع ہونے کے بعد جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہال میں داخل ہوئے جنرل ضیاء نے کانفرنس کی کارروائی روک کر سٹیج سے نیچے اتر کر اپنے استاد کا استقبال کیا اور ہاتھ پکڑ کر خود سٹیج پر لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کراچی میں لسانی فسادات کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ عصر اور مغرب کے درمیان ایک علمی نشست کا اہتمام کرتے تھے اور اپنے گھر میں دعوتِ عام دیتے تھے۔ آپ کی اولاد نہیں تھی، ہم سب آپ کے بچے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے اس عظیم شخصیت کی محافل میں بیٹھ کر آپ کے خیالات سننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ کی ایک تحقیقی کتاب کو جو انگریزی زبان میں تھی جناب ہلال احمد زبیری نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے ''برصغیر کی ملت اسلامیہ''۔ یہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے اہتمام سے کئی بار شائع ہوئی ہے۔ میرے ہاتھوں میں اس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۳ء ہے۔ اصلی کتاب قیامِ پاکستان سے قبل دہلی میں تحریر کی گئی تھی۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۳۸۔۲۳۹ سے من وعن تحریر کرتے ہوئے مجھے یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ میں اس عظیم محقق کے خیالات کی اشاعت کر سکوں۔

> ''اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے جسم میں بدترین شگاف شیعوں اور سنیوں کے درمیان مخاصمت سے پیدا ہو گیا تھا۔ مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی جدوجہد میں شاہ ولی اللہؒ کی حقیقی عظمت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب انہوں نے شیعوں اور سنیوں کے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خلافت پر ایک کتاب لکھی جس میں اس تمام مسئلہ پر مصالحانہ انداز سے بحث کی اور پہلے تین خلفاء کی شخصیتوں کے متعلق شیعوں کی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی (بحوالہ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء)۔ اس زمانے میں بہت سے سنیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ شیعہ مسلمان

نہیں ہیں۔شاہ ولی اللہؒ نے بڑی جرأت کے ساتھ اس قسم کی آراء کے خلاف آواز بلند کی اور یہ قرار دیا کہ شیعہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہیں (بحوالہ ''العقیدۃ الحسنہ'') شاہ ولی اللہؒ کی یہ رواداری اور اعتدال اس لیے اور بھی زیادہ تعریف کے قابل ہے کہ شیعوں کی طرف سے شدید مخالفت کے باوجود انہوں نے رواداری کی اس روایت کو اس قدر اچھی طرح قائم کر دیا تھا کہ ان کے نقش قدم پر چلنے کے باعث ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ پر بعض انتہا پسندوں نے یہ الزام لگایا کہ وہ شیعیت کی طرف رجحان رکھتے ہیں (بحوالہ مولانا مناظر احسن گیلانی ''تذکرۂ شاہ ولی اللہ'')۔اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ شاہ ولی اللہ برعظیم کے مختلف اسلامی فرقوں میں مفاہمت اور رواداری کی ایسی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے جس نے کبھی کبھار پیدا ہونے والی رکاوٹوں کے باوجود فرقہ وارانہ رواداری کی روایت کو برابر قائم رکھا ہے''۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ نے اپنی وصیت میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ عقائد کی بابت ہیں اور ان کا تعلق ان کے پیروکاروں اور قریبی احباب کے عقائد سے ہے' مگر عملی اعتبار سے آپ نے شیعہ سنی مفاہمت کے لیے سرتوڑ کوشش کی ہے۔شاہ صاحب نے خلفاءِ راشدین کے مقام و مرتبہ کا پاس کرتے ہوئے احتیاط کے دامن کو ہمیشہ سنبھالے رکھا ہے' آپ نہ کسی تفریق کے قائل تھے اور نہ ہی کسی ترجیح کے۔آپ معاملات کو فکر اور جذبات کی رو سے دیکھتے تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جذباتی وابستگی کا برملا اظہار جو شاہ صاحب نے کیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جذباتی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔دہلی اور اس اطراف واکناف میں سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کا اثر ورسوخ تھا جب کہ ملتان میں سہروردی بزرگ ایک اہم مقام رکھتے تھے۔تصوف کے یہ سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی جانشین تصور کرتے تھے اور یہی حال قادریوں کا تھا۔ہاں صرف نقشبندیوں کے ہاں روحانی جانشینی کا شرف بیک وقت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو حاصل تھا۔حضرت مجدد الف ثانیؒ سلسلۂ نقشبندیہ سے وابستہ تھے اور اس کی شاخ مجددیہ کے بانی تھے۔یہ سلسلہ وسط ایشیا کے فارسی بولنے والے سنی العقیدہ لوگوں میں مروج رہا ہے اور یہ لوگ خود کو شیعہ ایران کے خلاف حنفی عقیدہ کے مدافعین کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں' جبکہ باقی تینوں سلسلوں پر تشیع اور ایران کے اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں۔شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ صوفیانہ روحانی کیفیات اور خالص علمی استدلال کے دوراہے کے سنگم پر کھڑے تھے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات سے

روحانی رابطے کو دل کا معاملہ قرار دے رہے تھے' جبکہ خلفائے راشدین میں سے شیخین کی فضیلت کو علمی اور فکری انداز سے لے رہے تھے۔ یہ دل اور دماغ کے معاملات ہمیں تاریخ اسلام میں طریقت اور شریعت کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اہل طریقت کا میلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات کی جانب رہا ہے' مگر اس کے باوجود وہ خود کو حنفی سنی کہلاتے رہے اور فقہ حنفی کے پیروکار رہے ہیں۔ شریعت کا فروغ مطالعے اور تحقیق و تدقیق سے ہوا اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شریعت اور طریقت کی بحث میں احتیاط کا دامن تھامے رکھا ہے' جبکہ آپ کی اولاد کا رجحان فروغِ قرآن وسنت کی طرف ہو گیا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ زوال کے عہد میں شاہجہانی مسجد کے صحن سے لال قلعے کی دیواروں پر نظر ڈالتے تو انہیں نااہل اور بے اختیار مغل تاجدار نظر آتے۔ نگاہ نیچی کرتے تو وہاں پر سرمد جیسے منحرف صوفی شاعر کی قبر نظر آتی جسے اورنگ زیب کے حکم سے دارورسن کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ شمال کی جانب نگاہ دوڑاتے تو سکھوں کے نویں گورو تیغ بہادر کی سمادھ نظر آتی جو اورنگ زیب کے حکم سے زیب دار ہو چکا تھا۔ جنوب اور مغرب کی جانب دیکھتے تو وہاں پر مائیہ محل اور دلی کے زبوں حال مسلمان عوام کے چہرے پر مایوسی اور مردنی نظر آتی۔ آپ سماجی عدل اور معاشی انصاف کی بات کرتے اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لیے خیبر کے اُس پار سے احمد شاہ ابدالی کی جانب نگاہ دوڑاتے۔ اس ذہنی اذیت' فکری کشمکش اور مسلمانوں کے علمی دیوالیہ پن کے مدنظر آپ قرآن پاک کے فارسی ترجمہ کی جانب متوجہ ہوتے تو علماء کفر کے فتوے لگاتے۔ جب عام فہم فارسی میں ترجمہ کر لیتے تو دلی اور اکنافِ ہند کی یہ مروجہ مسلمان زبان طاقِ فراموشی کی زینت بن جاتی۔ پھر آپ کے بیٹے قرآن پاک کے اردو تراجم' احادیث اور سنت کے علوم کی اشاعت اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے احیاء کی بات کرتے۔ اس عہدِ ابتلاء میں اُمت مسلمہ میں مذہبی رواداری کا فروغ آپ کی ایسی خواہش تھی جس کی تکمیل کے لیے آپ باہمی اختلافات سے درگزر کرنے پر مجبور ہو چکے تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کے پائے کا پھر کوئی مفکر ہندوستان میں دو صدیوں تک ظاہر نہ ہو پایا' تا آنکہ علامہ اقبال کی صورت میں ایک عظیم مصلح اور مفکر کا ظہور ہوا۔ ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(سالہا سال زندگی کعبے اور بتخانے میں ماتم کرتی رہتی ہے' پھر کہیں جا کر عشق کی محفل

سے ایک راز دان کا ظہور ہوتا ہے۔)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی طرح علامہ اقبالؒ نے بھی وہی اسلوب اپنایا اور خود کو شیعہ سنی تعصّبات سے بہت اوپر لے گئے۔ علامہ اقبال کے وصیت نامہ پر اگر نظر دوڑائی جائے تو آپ خود کو سنی حنفی کہتے ہوئے اہل بیت رسول کی غیر متزلزل محبت کا دم بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آپ اس پہلو سے خود کو ہم عقیدہ سنی حضرات سے امتیازی حیثیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔

خود اورنگزیب عالمگیر کی وصیت کا مطالعہ کیا جائے تو بھی کچھ اور ہی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ آپ نے قرآن پاک کی کتابت سے جمع شدہ سرمایہ کو اس لیے اپنے کفن دفن پر خرچ کرنے سے اجتناب کیا ہے کہ شیعہ عقائد کی رو سے قرآن پاک لکھنے کا معاوضہ ناپسندیدہ امر ہے' اس لیے وہ ٹوپیوں کو سی کر جمع کیے گئے پیسوں سے کفن دفن کا انتظام کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر آپ نے کہا کہ میرے کفن پر حضرت امام حسینؓ کے روزہ سے اتاری ہوئی وہ چادر ڈال دی جائے جو ان کی والدہ ارجمند بانو ملقب بہ ممتاز محل (جو ایک شیعہ ایرانی خاتون تھیں) نے ان کے اوپر بچپن میں ڈالی تھی۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ نواسۂ رسول اور آلِ بیت کی شرم کھاتے ہوئے اس چادر کی وجہ سے شاید خداوند گناہوں میں ڈوبے ہوئے اس بندۂ ناچیز کی کوتاہیوں سے درگزر کرے گا۔

اس طرح کے وصیت ناموں کے مطالعہ سے ہمیں حیرت انگیز حقائق کا انکشاف ہوتا ہے' وہ انسان کی اندرونی جذباتی کیفیت کی عکاسی ضرور کرتے ہیں لیکن انسان کے اعمال اور گزری ہوئی زندگی کے حقائق اور واقعات کی نفی نہیں کر سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جس کشف کی بنیاد پر آنحضورﷺ کی زبانی جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اسے ایک روحانی کیفیت یا وجدانی حالت سے تعبیر تو کیا جا سکتا ہے مگر آپ نے زندگی بھر جس اتحاد بین المسلمین کی خاطر جدوجہد کی اس کی گواہی ہمیں شاہ صاحب کے تمام تر سوانح حیات میں ملتی ہے۔ آپ کے تمام تر سوانح نگار اس امر پر متفق ہیں کہ آپ نے شیعہ سنی گروہوں کو نزدیک لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ حقیقت آپ کی عظمت' فراست اور ہمت کی عکاس ہی نہیں وقت کی وہ اہم ترین ضرورت تھی جس کی جرأت اس عظیم زعیمِ ملت کو ہی ہو سکتی تھی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہبی، سیاسی، سماجی اور مالی معاملات میں مشکلات کا شکار ہو گئے اور احیاء و استحکامِ ملت کی کئی ایک تحریکیں تاریخ کے سینے پر دھڑکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سیاسی زوال کے باوجود ملت کے وجود کا احساس دن بدن پنپنے لگا۔ ان حالات میں برصغیر کے سنی اور شیعہ مسلمان بقائے باہمی اور تحفظ ملت کے لیے کئی مقامات پر متحد اور متفق نظر آتے ہیں۔ شیعہ احباب کا علامتی اظہار بھی جاری رہا اور اہل سنت نے اس سے قطعی طور پر تعرض نہیں کیا۔ انگریزوں کے آخری عہد میں چند ایک ناخوشگوار واقعات کے علاوہ ہمیں خال خال ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں مسلمان ملت میں کوئی واضح اختلاف کھل کر سامنے آیا ہو۔ ایک واضح ہندو اکثریت، سکھ اقتدار اور اثر و نفوذ، فکری، سماجی اور مالیاتی چیلنج اور انگریزوں کی غلامی کے باعث ملت اسلامیہ کی بقا کا راز اسی میں تھا کہ وہ بقائے باہمی کے اصول کو اپنا لیں۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی امر ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی وفات سے قیامِ پاکستان تک یہی اصول قومی زندگی میں غالب رہا اور ہمارے بزرگوں کی نسلوں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوچ کے عین مطابق احساسِ ذمہ داری، باہمی اخوت اور شیعہ سنی اتحاد کی اعلیٰ مثالیں قائم رکھیں۔ ایران سے آنے والے حکمران طبقات اقتدار کھونے کے بعد عوام میں گھلنے ملنے لگے اور ان کا تفاخر اور احساسِ برتری ماند پڑتا چلا گیا۔ اب شیرازی، تبریزی، کرمانی، گیلانی اور کاشانی لاحقوں کے علاوہ ان کی امتیازی شناخت ختم ہو گئی اور وہ ملت اسلامیہ ہند میں جذب ہوتے چلے گئے۔ عقائد و نظریات کے فروعی اختلافات سے صرفِ نظر کریں تو ہمیں تاریخ کے جھروکوں سے خوشگوار فضا کا احساس ضرور ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کسی نہ کسی حد تک شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مخلصانہ مساعی کے مرہونِ منت تھا۔ ۞ ۞ ۞

شیعہ سُنّی مفاہمت
کی ضرورت و اہمیت

از: ڈاکٹر اسرار احمد

۞ صفحات: 133 ۞ ۞ قیمت: 65 روپے

صبر
کامیابی کی کلید

بنت محیی

صبر بہت سے اہم ترین اخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے۔ حقیقت میں یہ کامیابی کی وہ کلید ہے جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ صبر کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لیے برابر مصروفِ کار رہنا۔ اس کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔

اپنی قوتوں کی پوری نشوونما اور اعتدال و تناسب کے لیے قرآن حکیم میں صبر اور صلوٰۃ سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی ہے اور ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۝۱۵۳﴾ (البقرۃ) ''یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ یعنی اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں، ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں اور وہ مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں صبر کے جو معنی رائج ہو گئے ہیں وہ اس کے اصل معنی و مفہوم کی مکمل ضد ہیں۔ ہمارے یہاں صبر کے معنی بے بسی، بے کسی، مجبوری، لاچاری اور مظلومیت کے لیے جاتے ہیں۔ گویا ظالم کے ظلم کی زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلنا صبر ہے۔ ہم اپنی انتہائی لاچاری، بے بسی و بے چارگی میں کہتے ہیں کہ صبر کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے! کسی کو تلقین کرتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ صبر کرو، صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے! یعنی ہمارے یہاں صبر انتہائی بے چارگی، بے بسی و لاچاری میں سپر ڈال دینا ہے۔

نظر کا زاویہ بدلتے ہی الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ قرآنی صبر کا مفہوم ہے ڈٹ

کر مقابلہ کرنا' اپنے پروگرام پر استقامت و استقلال سے کاربند رہنا اور راستے میں آنے والی تمام مشکلات کا ہمت' استقلال' پامردی و حوصلہ سے اور بغیر پاؤں میں لغزش لائے مقابلہ کرنا اور استقلال و استقامت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا' دوسروں کے مقابلے میں استقامت دکھانا اور ایک دوسرے کے لیے موجب استقامت بننا۔

مقصد آدمی کے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو جگا دیتا ہے۔ ہر کام پوری قوت مانگتا ہے اور وہی شخص بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے جو اپنی پوری قوت کو کام میں لگا دے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صبر ایک منفی عمل ہے' جبکہ حقیقت میں تو صبر ایک مثبت عمل ہے' بلکہ صبر تو مثبت عمل کی بنیاد ہے۔ صبر کے بغیر تو کوئی بھی مثبت عمل ممکن نہیں۔ صبر کا بلند ترین مقام یہ ہے کہ انسان بدی کو جھیلتے ہوئے نیکی سے اس کا جواب دے۔ صبر مؤمن کا بڑا ہتھیار ہے۔ صبر معصیت پر بھی ہے کہ گناہ سے خود کو روکا جائے اور صبر اطاعت پر بھی ہے کہ جو حکم ملے اسے بجا لایا جائے' خواہ نفس اس پر آمادہ نہ ہو۔ مثلاً شدید سردی میں گرم پانی میسر نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھی جائے کہ نماز فرض ہے اور اس کے لیے وضو شرط ہے۔ اسلام پر چلنے میں جو مشکلات و تکالیف آئیں' انہیں برداشت کرنا صبر ہے۔ زندگی کی الجھنیں سلجھانے کے لیے بھی صبر و ضبط کی ضرورت ہے۔ صبر اُس وقت ہوتا ہے جب آپ اپنے مقصد کا تعین کریں۔ کسی پر غصہ آئے یا کوئی غصہ کرے تو صبر و تحمل سے کام لیں۔ صبر کی توفیق صبر ہی سے ہے۔ جس کو صبر کی توفیق ہوگئی اسے گویا سب سے بڑھ کر نعمت مل گئی۔

صبر کے معنی ہیں دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا' دین حق کو قائم کرنے اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا' ہر خوف و لالچ کے مقابلہ میں راہِ راست پر ثابت قدم رہنا' جرائم سے پرہیز کرنا' حدود اللہ پر قائم رہنا' گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا' نیکی اور راستی کے راستہ میں ہر نقصان اور اس کی بدولت ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ بندۂ مؤمن کو جب کوئی ناگوار بات پیش آتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' جو کچھ ہوا اللہ کی حکمت سے ہوا' اس کی مشیت کے مطابق ہوا اور اللہ کی مصلحت اسی میں ہے۔ ہر ناگوار واقعے کے وقت انسان یہی سوچے اور صبر کا انداز اختیار کرے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کیسے کیسے صبر کیے! والدین کی محبت سے محروم ہوئے' دادا کی کفالت سے محروم ہوئے' لڑکپن مکے والوں کی بکریاں چراتے گزرا' نبوت کا زمانہ انتہائی

مشقت وابتلاء کا زمانہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو صبر کا دامن پکڑتا ہے اللہ اسے صبر کی توفیق دیتا ہے۔ اور کسی شخص کو ایسا عطیہ نہیں دیا گیا جو صبر سے بہتر اور وسیع تر ہو''۔ (بخاری و مسلم)

بچہ، بیوی، شوہر یا والدین سب انسان کے لیے محبوب ترین چیزیں ہیں۔ ان کی وفات پر اللہ کا حکم سمجھ کر صبر کرنا کمالِ ایمان کی علامت ہے اور بے صبری، جزع فزع، اول فول بکنا ضعفِ ایمان کی دلیل ہے۔ صبر کا صلہ جنت ہے اور جزع فزع اور اول فول اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

تمام اچھے اخلاق کے لیے ایک جامع لفظ ''صبر'' ہے۔ صبر کے بغیر اچھے اخلاق کا تصور نہیں ہے۔ طائف والوں کے مظالم پر رسول اللہ ﷺ کے صبر کی جزا دنیا میں معراج کی صورت میں سامنے آئی۔

صبر کی تین اقسام

(۱) اللہ کی عبادت پر صبر و استقامت

(۲) حرام باتوں سے پرہیز پر صبر و استقامت

(۳) مصائب و آفات پر صبر و استقامت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اُس بات پر صبر کرنے میں خیر کثیر ہے جو تمہیں پسند نہ ہو۔ (مسند احمد)

افضل عمل وہ ہے جس کو نفس ناپسند کرے مگر اسے اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیا گیا ہو۔ اگر آپ کو داعی بننا ہے تو مدعو کے ساتھ تمام جھگڑوں کو یکطرفہ طور پر ختم کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو متواضع اخلاق اختیار کرنے ہیں تو اپنے سینے کو تکبر سے پاک کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو لوگوں کا خیر خواہ بننا ہے تو اپنے اندر اٹھنے والے حسد کے جذبات کو دبانا ہوگا۔ اگر آپ لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کو ذبح کرنا ہوگا۔ اور یہ سب چیزیں وہ ہیں جو صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان کا حصول ممکن نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان کو ہر حال میں صبر سے کام لینا چاہیے، ورنہ ندامت کا سامنا ہوگا۔

صبر کے بندھن کو دو چیزیں توڑ دیتی ہیں:

(۱) داخلی خواہشات (۲) خارجی اشتعالات

انسان کی داخلی خواہشات (نفس کی خواہشات) اس قدر شدید ہوتی ہیں کہ وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ خارجی ماحول میں مرضی کے خلاف باتیں اور ایسے حالات جو انسان کو اشتعال

دلانے والے ہوں' غیظ وغضب کو بھڑکانے والے ہوں' ایسے حالات میں انسان کا حق پر قائم رہنا اور صحیح طریقہ اختیار کرنا صبر ہے۔ بے صبری اچھے نتائج نہیں دکھاتی۔ ایسے مواقع پر صبر کرنا ضروری ہے' اس سے عافیت ملتی ہے۔

وہ حالات و کیفیات جن کے سامنے انسان بند نہیں باندھ سکتا' مثلاً بھوک پیاس میں کھانا پینا' نماز کے لیے نیند سے بیدار ہونا' محبت' نفرت' انتقام کا جذبہ' خوشی' دلی خواہشات و جذبات' ان کی وجہ سے انسان حدیں توڑ جاتا ہے۔ غصے میں انسان حسد و انتقام کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتا ہے جو حد درجہ کی بے اعتدالی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق انسان ہے۔ دنیا میں اللہ کا انعام اور رحمت و نعمت (ایمان کے بعد) اولاد ہے۔ بچے کو بنانا' سنوارنا' سمجھانا ایک ماں کی ذمہ داری ہے۔ بچے کی ذہنیت اور اس کے افعال و افکار کو صاف ستھرا بنانا ماں کے صبر کی جزا ہے۔ بچوں کو نظریہ ماں دیتی ہے۔ اگر ماں نے نظریہ ہی صحیح نہ دیا ہو تو وہ قصوروار ہے۔ تعلیم بعد کی چیز ہے۔ نظریہ اہم تر ہے۔ عورت انسانوں کی پیدائش کا کھیت ہے۔ کسان کی طرح عورتوں کی صحیح تربیت پر اپنی جان لڑا دینی چاہیے تاکہ انسانیت کے بہترین نمونے معاشرے کو مل سکیں۔

بچے احساسات کا سمندر ہوتے ہیں' ان سے کھل کر بات کریں۔ صبر سے ان کی بات سنیں اور استقلال سے ان کی تربیت کریں تو وہ احساسات کی شناخت کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم مسلمان مَردوں اور خاص طور پر عورتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی طرف یکسوئی سے توجہ دیں۔ جب تک مسلمان مائیں اُمت کے لیے بہادر' امین' محنتی' خوش اخلاق' راست باز اور مستقل مزاج بچے مہیا نہ کریں گی ہماری قوم کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح ممکن نہیں۔ اس کام کے لیے جسمانی' روحانی' داخلی' خارجی' انفرادی' اجتماعی ہر طرح کا صبر درکار ہے۔ اس صبر کے لیے اللہ کی رسّی کو تھامنا اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے قدموں سے لپٹنا یعنی ان کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ اللہ ہمیں صبر کے تمام مراحل بخوبی گزروا کر صبر کا میٹھا پھل دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں عطا فرمائے (آمین)۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی' نہ آگے بڑھ سکتی ہے' جب تک کہ وہ قرآنی مفہوم میں ''الصابر'' نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ''صابر'' ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ تو بے بس' لاچار و مایوس قوم ہوگی۔ دنیا میں ہم آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ دنیا میں ہمارا امتحان ہر روز بلکہ ہر آن ہو رہا ہے' ہر صلاحیت جو ہمیں ملی

ہے اس کا حق و اعتدال پر قائم رہ کر صحیح استعمال مشکل کام ہے۔ پہلے اپنی ذات پر اس چیز کو لاگو کرنا ہے اور بعد میں گھر والوں، قرابت داروں، پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو اس کی ترغیب دینی ہے۔ ایک حدیث نبویؐ ہے کہ ''جہنم خواہشات سے ڈھانک دی گئی ہے اور جنت ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانک دی گئی ہے''۔ (بخاری)

غزوۂ اُحد میں نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا۔ آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ آپؐ ایک گڑھے میں گر گئے۔ آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے اور ان کا مثلہ کر دیا گیا۔ آپ ﷺ ایذا پہنچانے والوں اور جاہلوں سے درگزر فرماتے۔ اپنی ذات کے لیے انتقام نہ لیتے۔ دعوتِ دین میں پہنچنے والی تکلیفوں کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے۔ بجائے مشتعل ہونے کے آپ ﷺ دعا فرماتے۔ دعوت و تبلیغ کا کام پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں بھری راہگزر ہے۔ اس میں داد و تحسین کے بجائے طعن و ملامت اور خشت زنی حصے میں آتی ہے، اس لیے صبر و تحمل اور ضبط و برداشت ضروری ہے۔ جنت حاصل کرنے والا خواہشات اور نفس کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ فارسی کی مثل ہے: ''صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد'' یعنی صبر کڑوا ضرور ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ناقدری و ناپسندیدگی کو برداشت کر لینا خود پر ظلم محسوس ہوتا ہے، مگر کسی اور پر الٹا غصہ کرنا، اپنے آپ کو پریشان رکھنا، اندر ہی اندر جلنا، کڑھنا، بڑبڑانا، یہ صبر نہیں ہے۔ مثبت راہوں کا تلاش کرنا صبر ہے۔ جسمانی بھوک تو جلد مٹ جاتی ہے، روحانی بھوک کا انتظام کرنا اہم ہے، اس کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ دین کے راستے میں ہم جذبے سے کام شروع کرتے ہیں اور پھر لوگوں کی باتیں اور نگاہیں ہمیں اس کام سے روک دیتی ہیں۔ صبر تو برداشت کا نام ہے اور استقامت کا بھی۔ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں اعلیٰ ظرفی ہوتی ہے۔ تھڑدلا انسان تو گھبرا کر بیٹھ جاتا ہے۔

اگر کسی دریا میں پہاڑ بھی ٹوٹ کر گر جائے تو وہ شور نہیں کرتا، لیکن اگر ایک گلاس پانی میں ایک چھوٹا سا پتھر بھی ڈال دیں تو پانی اچھل کر باہر آ جائے گا۔ کسی کا دل دریا ہوتا ہے، اس پر اگر پہاڑ جیسی مصیبت بھی آ جائے تو وہ برداشت کر لیتا ہے، شور نہیں کرتا، نہ چیختا چلاتا ہے اور نہ ہی واویلا کر کے بداخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جبکہ کسی کا دل ایک گلاس یا پیالے کی مانند ہوتا ہے کہ اس میں ایک چھوٹا پتھر بھی ڈالیں تو چھینٹیں اچھل کر باہر آ جاتی ہیں۔ جب تک انسان کا اپنا

ظرف بڑا نہیں ہوتا' انسان کے اپنے اندر وسعت نہیں آتی اس وقت تک صبر نہیں آتا۔ وسعت کیسے آتی ہے؟ اس کا کیا راز ہے؟ ظرف بڑا کیسے ہوتا ہے.....؟

جب انسان اللہ کے لیے' آخرت کی جزا کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی نیت خالص کر لیتا ہے' جب انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ جڑنے لگتا ہے' جب انسان کا مقصد بڑا ہو جاتا ہے تو نتیجہ بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اللہ کی پسند اور آخرت کی جزا بڑا مقصد ہے۔ جب اللہ پر توکل کر کے اپنے تمام معاملات' مصائب اور پریشانیوں کا حل رضائے الٰہی میں تلاش کرنے لگتے ہیں تو صبر آجاتا ہے۔

صبر کی دو اقسام

(۱) بدنی: جیسے مشقت برداشت کرنا' عبادت کے مشکل اعمال برداشت کرنا۔

(۲) نفسیاتی: خواہش کے تقاضوں اور طبیعت کا مرغوب چیزوں سے رک جانا۔

صبر کی یہ قسم اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے متعلق ہو تو اس کا نام عفت ہے۔ اگر میدان جنگ میں صبر ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔ اگر غصے کو دبانے سے متعلق ہو تو اس کا نام حلم ہے۔ اگر کسی پریشان کرنے والی مصیبت سے ہو تو اس کا نام برداشت ہے۔ اگر کسی معاملے کو پوشیدہ رکھنے سے ہو تو اس کا نام راز کا چھپانا ہے۔ اگر زائد ضروریات سے روکنا ہو تو اس کا نام زہد ہے۔ اگر تھوڑی سی ضرورت پر مطمئن ہونا ہو تو اس کا نام قناعت ہے۔

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان نام ہے صبر و سماحت کا۔ یعنی ایمان یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے راہِ خدا پسند کرے اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کو برداشت کرے اور خدا کے سہارے آگے بڑھتا جائے' یہ صبر ہے۔ اور آدمی اپنی کمائی خدا کے بے سہارا اور محتاج بندوں پر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے اور خرچ کر کے خوشی محسوس کرے تو یہ سماحت ہے۔

اپنی ذات کی صفائی اور تزکیہ بھی صبر ہے۔ اپنے اندر کی ناپسندیدہ خواہشات کو نکالنے اور خرابیوں کو دور کرنے کے لیے صبر چاہیے۔ دلوں میں نفرتوں کو نہ پالیں۔ عفو و درگزر سے کام لیں۔ لوگوں کی اچھائیوں' خوبیوں اور کامیابیوں پر دل کا جلنا شیطانی عمل ہے۔ اس سے بچیں' رکیں اور صبر کریں۔ دل میں وسعت پیدا کریں۔ صبر روشنی ہے۔ آخرت میں پل صراط پر سے گزرتے وقت بھی یہ روشنی مؤمن کے کام آئے گی۔

خود کو روکنا بزدلی نہیں بلکہ بہادری ہے۔ اعلیٰ ظرف ہی خود کو روک سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کس طرح بندوں کی نافرمانیوں پر، شرک پر، کفر پر، بدعات پر اور من مانیوں پر صبر کیے ہوئے ہے۔ شیطان کو اس کی نافرمانی پر ختم نہیں کیا، اس کو آزادی دی، وسوسے ڈال کر انسان کو بہکانے کا موقع دیا۔ اللہ کہتا ہے کہ ''ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے، بھوک سے، اور مالوں، جانوں اور ثمرات کی کمی ونقصان سے''۔ طاعون یا اسی قسم کی وبائی بیماری میں اللہ کی تقدیر ومشیت پر ایمان رکھتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرے رہنا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں جزع فزع اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا ایک مؤمن کو شہادت کے رتبے سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ بعض اور لوگوں کو بھی یہ اجر ملے گا، جیسے غرق ہو کر مرنے والے کو اور حالت زچگی میں فوت ہونے والی عورت کو۔ یہ حکم اس لیے ہے تاکہ وبائی مرض دوسرے شہروں میں نہ پھیلے۔ دوسرے شہروں کے رہنے والوں کو حکم ہے کہ وہ طاعون زدہ شہر میں جانے سے پرہیز کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حفاظت اور علاج کے اسباب اختیار کرنا تقدیر الٰہی پر ایمان رکھنے کے منافی نہیں ہے۔ عدم بصارت دنیا میں بہت بڑی محرومی ہے۔ حدیث کی رو سے اس محرومی پر صبر کا بہت بڑا اجر ہے اور اس کی جزا جنت ہے، بشرطیکہ نابینا دولت ایمان سے مالا مال ہو۔ (بخاری)

صبر ایسا ہتھیار ہے جس کی ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت ہے۔ صبر عبادتوں میں بڑی عبادت ہے۔ اپنے آپ سے خود کام کروائیں یہ صبر ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ قربانی بھی وہی دیتا ہے جس میں صبر ہو۔ تکلیفوں اور شکایتوں پر خاموش رہنا صبر ہے۔ اگر کوئی ہماری شکایتیں کرے تو اس کو احسن طریقے سے برداشت کرنا بھی صبر ہے۔ یعنی تنقید کو اچھے طریقے سے برداشت کرنا صبر ہے۔ جہاں آپ بول سکتے ہیں مگر مصلحتاً خاموش رہتے ہیں تو یہ بھی صبر ہے۔ بھڑکنے والی بات پر نہ بھڑکنا بھی صبر ہے۔ رکاوٹیں عبور کرتے جانا، سفر جاری رکھنا بھی صبر ہے۔ صبر صدمے کے آغاز میں ہوتا ہے، لیکن زندگی کے اختتام تک صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ صبر وقتی طور پر کسی خاص موقع پر اپنے آپ کو کنٹرول کرنا نہیں، بلکہ زندگی بھر کنٹرول کرتے ہی رہنا ہے۔

صبر کیا ہے؟..... آزمائش ہے اللہ کی طرف سے جو اس پر راضی ہو جاتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔ صبر وہ ہے جو سینے پر پہلی چوٹ لگتے وقت کیا جائے۔ اللہ کیوں آزماتا ہے.....؟ چمکانے کے لیے، خوبصورت و پسندیدہ بنانے کے لیے زیادہ تپاتا ہے جیسے سونے کو خالص کرنے

کے لیے تپایا جاتا ہے۔ اللہ جس کو اپنا بنانا چاہتا ہے‘ اس سے کام لینا چاہتا ہے اُسی کو آزماتا ہے: ؎

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

دعوتِ اسلامی اور راہِ حق میں ہر ہر قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور ہر ہر مرحلے پر مصائب منتظر نظر ہوتے ہیں۔ اس لیے صبر اس راہ کا بہترین زادِراہ ہے۔

ہر اچھی نہ لگنے والی چیز کے جواب میں اچھا معاملہ کرنا اور منفی رویے سے بچنا صبر ہے۔ دنیا میں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر چیز آپ کی مرضی کے مطابق ہو۔ ہر ایک اپنی اپنی مرضی کا مالک ہے۔ سب کو بدلنا آسان نہیں‘ لیکن خود کو بدلنا مشکل نہیں۔ صبر کرنا یقیناً مشکل ہے‘ ناممکن نہیں۔ خود کو سمجھیں اور کنٹرول کریں۔ خود کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں‘ اللہ کی مرضی کے مطابق ڈھال کر زندگی کو آسان و پرسکون بنائیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس کو کوئی مشکل پیش آئے وہ میری مشکل کو یاد کرلے تو اسے اپنی مشکل آسان نظر آئے گی۔ صبر ہی انسان کی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ صبر نام ہے بہادری کا۔ بہادر چومکھی لڑائی لڑنا جانتا ہے۔ آیئے بہادر بنیں‘ چومکھی لڑائی لڑیں اور لڑتے رہیں؟ نفس کی خواہشوں اور رغبتوں پر صبر‘ نفس کے لالچ اور طمع پر صبر‘ اس کے ضعف و کمزوری پر صبر‘ اس کی جلد بازی پر صبر‘ لوگوں کی جہالت پر صبر‘ غلط تصورات پر صبر‘ لوگوں کی کج فطرتی پر صبر‘ کج باطنی پر صبر‘ ان کی کج فہمی پر صبر‘ ان کے غرور اور حق سے گریز پر مبنی حیلے بہانوں پر صبر‘ شر کے طاقتور ہونے پر صبر‘ بے یار و مددگار ہونے‘ راہ کے طویل اور پرصعوبت ہونے پر صبر‘ تنگی و تکلیف میں آنے والے شیطانی وساوس پر صبر۔ رنج و غم‘ غصہ و طیش‘ بے اعتمادی و ناامیدی جیسے نفسیاتی امراض پر صبر‘ ضبطِ نفس پر صبر‘ ہر تنگی و فراوانی میں رضائے الٰہی کو مدنظر رکھیں‘ ہر معاملے میں اسی پر توکل کریں‘ اسی سے ڈریں اور اسی کا تقویٰ اختیار کریں۔

آیئے‘ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں‘ آگے بڑھیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ ہم راہِ حق کے راہی خود ہی اس کی لذت کو محسوس کریں اور استقامت‘ بہادری‘ صبر و قناعت‘ متانت و پامردی کے ساتھ رضائے الٰہی چاہنے والے اور نبی اکرم ﷺ کے طریقے پر چلنے والے قافلے میں مزید قافلوں کو راہِ حق کا راہی بنا کر خلوصِ نیت کے ساتھ اس پر رواں دواں ہوجائیں۔ oo

قدیم وجدید جنگوں میں گھوڑوں کی اہمیت

حافظ محمد مشتاق ربانی

قرآن شریف میں گھوڑوں کو بطورِ زینت اور نعمت پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴ میں جہاں انہیں بطور زینت پیش کیا گیا' وہاں ان کی صفت ''اَلْمُسَوَّمَةِ'' یعنی ''نشان لگے ہوئے'' یا ''عمدہ'' بیان ہوئی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (ت ۱۳۶۹ھ) ﴿اَلْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''یعنی وہ گھوڑے جن پر نمبر یا نشان لگائے جائیں' یا پچ کلیان گھوڑے جن کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی پر قدرتی نشان ہوتے ہیں' یا جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑے گئے ہوں۔'' اسی طرح قرآن پاک میں سورۃ العٰدیٰت پوری کی پوری ان کی بعض صفات کے ضمن میں ہے۔

ایک مستشرق مسٹر کونسٹن ورجیل' جو رومانیہ کے وزیر خارجہ رہے ہیں' انہوں نے سیرتِ نبویؐ پر ایک کتاب لکھی ہے' جس کا ترجمہ ''عکس سیرت'' کے نام سے اردو میں دستیاب ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں: ''غزوۂ بدر ایک پہلا موقع تھا کہ مسلمان جنگی مشن میں گھوڑے استعمال کر رہے تھے۔'' اس غزوہ میں مسلمانوں کے پاس ابن ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ'' اور السُّھیلی (ت ۵۸۱ھ) کی ''الرّوض الأنف'' (جو ابن ہشام کی سیرت کی کتاب کی شرح ہے) کے مطابق تین گھوڑے تھے۔ ایک گھوڑا مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ کا' جس کا نام ''السّبل'' تھا۔ دوسرا گھوڑا المقداد بن عمرو البہرانی رضی اللہ عنہ کا' جس کا نام ''بعزجۃ یا سبحۃ'' تھا۔ تیسرا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا' جس کا نام ''الیعسوب'' تھا۔ لیکن امام بیہقیؒ (ت ۴۵۸ھ) کی ''دلائل النبوۃ ومعرفۃ أحوال صاحب الشریعۃ'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:
ماکان معنا الا فرسان: فرس للزبیر وفرس للمقداد بن الأسود یعنی یوم البدر ''بدر

کے روز ہمارے پاس صرف دو گھوڑے تھے: ایک گھوڑا زبیر بن العوام کا' اور دوسرا گھوڑا المقداد بن الاسود کا تھا''۔''دلائل النبوۃ'' میں المقداد بن عمرو البہرانی کی بجائے المقداد بن الاسود ہے''جن کے گھوڑے کا نام''ابلق'' بتایا گیا ہے۔

گھوڑوں کے یہ مختلف نام ان کے الوان اور صفات کی بنا پر رکھے جاتے تھے۔مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکین کے پاس گھوڑے ابن ہشام کی''السیرۃ النبویۃ'' کے مطابق ایک سو تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان تعداد اور قوت کے اعتبار سے مشرکین کے مقابلے میں کس قدر کم تھے۔

سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے تناظر میں نازل ہوئی' اس کے زیادہ تر مضامین اسی غزوہ سے متعلق ہیں۔اس سورت کی آیت ۶۰ میں مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کے لیے کہا گیا' لیکن وہاں ﴿مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ﴾ کے الفاظ ہیں جن کے بارے میں مفتی محمد شفیعؒ (ت ۱۳۹۶ھ) فرماتے ہیں:''تمہاری کامیابی کے لیے ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اتنا ہی حاصل کرلو' بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کرلو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد تمہارے ساتھ ہوگی۔''

اس آیت میں ﴿قُوَّةٍ﴾ ذکر کرنے کے بعد ﴿وَمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ﴾ کا ذکر کیا اور یہ ﴿قُوَّةٍ﴾ پر معطوف ہے' جس طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۹۸ میں ﴿جِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰٮلَ﴾' ﴿مَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ پر معطوف ہے۔بہرحال''رباط''مفعول یعنی مربوط کے معنی میں اور مصدر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی ﴿مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ﴾ کا مفہوم''تدبر قرآن'' میں یوں بیان فرماتے ہیں:''اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیے جائیں' اور اس غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں' کیونکہ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے۔''

جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے گھوڑے رکھنے کی بڑی فضیلت ہے۔جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلۡخَيۡلُ لِثَلَاثَةٍ: لِرَجُلٍ أَجۡرٌ، وَلِرَجُلٍ سِتۡرٌ، وَعَلٰى رَجُلٍ وِزۡرٌ. فَأَمَّا الَّذِىۡ لَـهٗ أَجۡرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَأَطَالَ لَهَا فِىۡ مَرۡجٍ أَوۡ رَوۡضَةٍ ، فَمَا أَصَابَتۡ فِىۡ طِيَلِهَا ذٰلِكَ مِنَ الۡمَرۡجِ أَوِ الرَّوۡضَةِ كَانَتۡ لَـهٗ حَسَنَاتٍ ، وَلَوۡ

اَنَّهَا قَطَعَتْ طِيَلَهَا فَاسْتَنَّتْ شَرَفًا اَوْ شَرَفَيْنِ كَانَتْ آثَارُهَا وَاَرْوَاثُهَا حَسَنَاتٍ لَهُ ، وَلَوْ اَنَّهَا مَرَّتْ بِنَهْرٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ وَلَمْ يُرِدْ اَنْ يَسْقِيَ بِهٖ كَانَ ذٰلِكَ حَسَنَاتٍ لَهُ ، فَهِيَ لِذٰلِكَ الرَّجُلِ أَجْرٌ، وَرَجُلٌ رَبَطَهَا تَغَنِّيًا وَتَعَفُّفًا وَلَمْ يَنْسَ حَقَّ اللّٰهِ فِيْ رِقَابِهَا وَلَا ظُهُوْرِهَا فَهِيَ لَهُ سِتْرٌ، وَرَجُلٌ رَبَطَهَا فَخْرًا وَ رِيَاءً وَنِوَاءً فَهِيَ عَلٰى ذٰلِكَ وِزْرٌ (متفق علیہ)

''گھوڑوں کو پالنے والے تین قسم کے ہیں: ایک تو اجروثواب پانے والے' ایک نہ تو ثواب نہ عذاب' ایک عذاب بھگتنے والے۔ پس جو جہاد کے ارادے سے پالے اس کا گھوڑا چرے چگے' چلے پھرے' جو کرے اس پر ثواب ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اپنی رسّی توڑ کر کہیں چڑھ جائے تو بھی اس کے نشاناتِ قدم اور اس کی لید پر بھی اسے نیکیاں ملتی ہیں۔ کسی نہر پر گزرتے ہوئے وہ پانی پی لے اگرچہ مجاہد نے پلانے کا ارادہ نہ بھی کیا ہو تب بھی اسے نیکیاں ملتی ہیں۔ پس یہ گھوڑا اپنے پالنے والے کے لیے بڑے اجروثواب کا ذریعہ ہے۔ اور جس شخص نے گھوڑا پالا کہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہوجائے' پھر خدا کا حق بھی اس کی گردن اور اس کی سواری میں نہ بھولا یہ اس کے لیے پردہ ہے' یعنی نہ اس کے لیے اجر ہے نہ گناہ۔ تیسرا وہ شخص ہے جس نے فخر وریا کے طور پر پالا اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تو وہ اس کے ذمہ وبال ہے۔''

اس ضمن میں فقہی طور پر یہ بھی یاد رکھیں کہ مالِ غنیمت میں پیادہ کے لیے ایک حصہ ہے اور سوار یعنی جو گھوڑے پر ہو اس کے لیے تین حصے ہیں۔ ایک سوار کے لیے اور دو گھوڑے کے لیے۔ اکثر فقہاء کا یہی مذہب ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک گھوڑے کی سواری سیکھنا بنسبت تیراندازی کے افضل ہے۔ امام ابن کثیرؒ (ت ۷۷۴ھ) کے نزدیک قولِ جمہور اقویٰ ہے کہ تیراندازی گھڑسواری کی نسبت افضل ہے۔

اگرچہ آج کے دَور میں گھوڑوں کی جگہ گاڑیوں وغیرہ نے لے لی ہے' لیکن آج کے دور میں بھی سامانِ حرب میں گھوڑوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ بہت سے ایسے مقامات آج بھی ہیں جہاں پر صرف ان کی مدد سے ہی رسائی ممکن ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دشمن کے مقابلے میں ہر طرح کے ہتھیار تیار رکھیں' اپنی جوہری توانائی کی بھرپور حفاظت کریں اور اس ملک کی باگ ڈور ایسے عناصر کو نہ سونپ دیں جو اِس کی حفاظت کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ oo

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (57)

عـــراق

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

عراق : ایک نظر میں

پورا نام: جمہوریۂ عراق
رقبہ: 437,072 مربع کلومیٹر
آبادی: دو کروڑ، چون لاکھ
اوسط عمر: 68 برس
گنجانی آبادی: 146 فی مربع میل
دارالحکومت: بغداد (48 لاکھ)
زبانیں: عربی، کُردی
نسلیں: عرب 80 فیصد۔ کُرد 20 فیصد
مذہب: مسلمان 97 فیصد، عیسائی اور دیگر 3 فیصد
شرح خواندگی: 40 فیصد
طرزِ حکومت: فی الحال عبوری (زیرِ سرپرستی امریکا)
کل قومی پیداوار: 37.92 ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 1500 ڈالر
سالانہ شرح نمو: 21.8 فی صد
افراطِ زر: 29 فیصد
قابل کاشت رقبہ: 13.15 فیصد
زراعت: گندم، جو، چاول، سبزیاں، کھجور، کپاس، مویشی

صنعت: تیل، کیمیکلز، پارچہ بافی، تعمیراتی سامان، ڈبہ بند غذائیں
تیل کی سالانہ پیداوار: 2.2 ملین بیرل روزانہ
تیل کے ذخائر: 113.8 ارب بیرل
گیس کے ذخائر: 3.149 ٹرلین کیوبک میٹر
برآمدات: 7.542 ارب ڈالر (خام تیل)
درآمدات: 6.520 ارب ڈالر (غذا، ادویہ، مشینیں)
تجارتی ساتھی: امریکا، ترکی، اردن، ویت نام، کینیڈا، جرمنی، اٹلی، مراکش، برطانیہ
بیرونی قرضہ: 95 ارب ڈالر
ریلوے: 1963 کلومیٹر
سڑکیں: 45,550 کلومیٹر
بندرگاہ: اُم قصر، بصرہ، خاور الزبیر
اخبارات کی خواندگی فی ہزار: 30
کاروں کی تعداد فی ہزار: 60

(عراق کی حکومت اور وہاں کے عوام کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، لہٰذا مذکورہ اعداد و شمار میں کمی بیشی کا امکان ہے)

جغرافیائی خدوخال

ارضی خدوخال کے اعتبار سے عراق میں زبردست رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ شمال مشرق اور شمال میں ایران اور ترکی کی سرحد کے قریب عراقی پہاڑوں کی اونچائی سطح سمندر سے تین ہزار میٹر کے قریب ہے، جبکہ جنوب مشرق میں شط العرب کے میدانوں اور دلدلی علاقوں کی اونچائی سطح سمندر سے صرف

چند میٹر اونچی ہے۔عراق کا بیشتر علاقہ ریگستانی ہے اور زیادہ تر آبادی دجلہ اور فرات دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں آباد ہے۔عراق کی آبادی کی تقسیم اور زراعت و معیشت پر ملک کے دو بڑے دریاؤں دجلہ و فرات اور اُن کی معاون ندیوں کا بڑا اثر ہے۔ دجلہ اور فرات دونوں دریا آرمینیا کے بلند پہاڑی علاقوں سے نکل کر گہری عمودی وادیوں اور ٹیڑھے ترچھے راستوں سے گزر کر کوہستانی منزل طے کرتے ہوئے عراق کے شمالی کُردستانی میدان میں داخل ہوتے ہیں۔

دنیا کی 80 فیصد کھجور عراق میں پیدا ہوتی ہے۔کھجور کا پیڑ گرم خشک' ریتلی اور کھاری دریائی مٹی میں بہتر طریقے سے پروان چڑھتا ہے۔جن جگہوں پر آبپاشی کا اچھا انتظام ہے' وہاں کی کھجوریں بہتر قسم کی ہوتی ہیں اور زیادہ پیداوار دیتی ہیں۔بصرہ کے قرب و جوار کا علاقہ کھجور کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

تاریخی پس منظر

عراق کی تاریخ کا آغاز غیر ملکی حملہ آوروں سے ہوتا ہے جو 3500 ق م اور 3200 ق م کے درمیان دریائے دجلہ و فرات کے سنگم پر اُر کے مقام پر آباد ہوئے اور انہوں نے سمیر کی دو تاج والی بادشاہت قائم کی۔سمیریوں نے غالباً سب سے پہلے پہیہ گاڑیاں استعمال کیں۔اس کے علاوہ انہوں نے میخی طرزِ تحریر ایجاد کیا۔معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں سے ان لوگوں کے قریبی روابط تھے' کیونکہ ان کی مہروں پر بعض ہندوستانی جانوروں کی تصاویر کندہ ہیں' اور موئن جودڑو کے مقام پر بعض ایسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جو سمیریا کے کھنڈروں سے بھی ملی ہیں۔سمیری لوگ تاریخِ عالم کے اوّلین جنگجو اور سپاہی منش لوگوں میں سے ہیں۔سمیر اور عکاد کی حکومت 2300 قبل مسیح تک قائم رہی' جس کے بعد بابل کو اقتدار حاصل ہوا اور اس پر عموریوں کی حکومت قائم ہوئی۔یہ لوگ سمیریوں کے برعکس سامی نسل سے تھے اور شمالی شام سے آئے تھے۔قانون پسند حمورابی (2081 ق م) ان کا سب سے مشہور حکمران گزرا ہے۔اُس کے عہدِ حکومت میں حتّیوں نے شمال مغرب سے اور کاسی لوگوں نے شمال مشرق سے حملے شروع کر دیے۔

1746 قبل مسیح میں ایک بادشاہ نے اپنے آپ کو چار مملکتوں سمیر' عکاد اور بابل وغیرہ کا بادشاہ قرار دیا اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھی جو آئندہ چار سو سال تک حکمران رہا۔1182 ق م میں عیلام سے ایک حملہ ہوا جس نے کاسی حکومت کو شکست دی۔اس کے چند برس بعد بابل میں بغاوت ہو گئی اور ایک مقامی خاندان پاشے کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آ گئی۔یہ خاندان 132 برس حکمران رہا' حتیٰ کہ اشوریوں نے 1025 ق م میں اس خاندان کے سب سے نامور بادشاہ بخت نصر اوّل کو شکست دی۔738 قبل مسیح کے قریب تمام بابل اشوریوں کی عمل داری میں آ گیا۔اشوریوں نے غالباً سب سے پہلے ڈاک رسانی کا محکمہ قائم کیا۔ان کا دارالحکومت نینوا تھا۔

625ق م کے قریب بابل پھر برسر اقتدار آیا اور وہاں بخت نصر ثانی نے ایک ایسی سلطنت قائم کی جو 539ق م تک قائم رہی۔ 539ق م میں بابل پر پھر عیلامیوں نے حملہ کیا' آخری بادشاہ بل شیرز کو شکست ہوئی' اور فارس کا بادشاہ سائرس فاتح ہو کر بابل میں داخل ہوا۔ اگرچہ شہر بابل کو ایرانی عہد حکومت میں بھی اقتدار حاصل رہا' مگر اب بابل تجارتی مرکز تھا۔ اس کی وہ فوجی اور سیاسی اہمیت ختم ہو چکی تھی جو اسے اشوری سلطنت میں حاصل تھی۔ عراق پر فارس کی حکومت 539ق م سے 331ق م تک رہی۔ اس کے بعد 341 تا 141ق م سکندر اعظم اور اُس کے جانشین جرنیل حکمران رہے۔ 141ق م سے 226ء تک اس پر پارتھیا کی حکومت رہی۔ 226ء سے 637ء تک اس پر ساسانی بادشاہوں کا تسلط رہا۔

اسلام کا ظہور و قیام

سرزمین عرب سے اسلام کا عالمگیر انقلابی پیغام اٹھا اور اس نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی حکومتوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ مسلمان فاتح عالم بن کر اٹھے اور ایمانی قوت کے ساتھ ایران کی پُرشکوہ سلطنت سے ٹکرا گئے۔ مسلمان فاتحین اپنی پوری قوت کے ساتھ عراق پر پل پڑے اور یہیں انہوں نے اپنی ابتدائی عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ انہوں نے اچانک سخت حملے کر کے دریائے فرات کے کنارے ایران کی سرحدی چوکیاں چھین لیں اور بے خوف و خطر آگے بڑھتے گئے' حتیٰ کہ جنگ نہاوند (642ء) میں ساسانی شہنشاہوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ مسلمانوں نے بڑی دانش مندی اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے حملوں کے لیے ایک 400 میل لمبا عسکری مرکز قائم کیا' جس کی مشرقی اور مغربی سرحدوں پر بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیاں تھیں۔ طیسفون (Ctesiphon) اس ملک کا خوشحال دارالحکومت تھا' جسے بری طرح تاخت و تاراج کیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا قلعہ بند شہر المدائن کے تاریخی شہر کے کھنڈروں پر بسایا گیا' جو مدت تک خستہ حال رہا' حتیٰ کہ بغداد میں مدغم ہو کر رہ گیا۔ نوزائیدہ سلطنت اسلامی کے اس حصے کے انتظام کے بارے میں دوراندیش خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بے حد توجہ صرف کی اور کوفہ اور بصرہ میں علیحدہ علیحدہ عامل مقرر کیے۔ ابتدا میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کوفہ کے عامل مقرر ہوئے' لیکن ہمیشہ شاکی رہنے والے کوفیوں کی درخواست پر اُن کی جگہ حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کو بھیجا گیا' مگر وہ اس عہدے کی ذمہ داریوں کو باحسن طریق نہ نبھا سکے۔ اُن کے جانشین حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ہوئے۔ بالآخر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو دوبارہ یہ عہدہ دیا گیا۔ اُن کے بعد حضرت ولیدؓ بن عقبہ اور حضرت سعیدؓ بن العاص مقرر ہوئے۔

بصرہ کا نظام زیادہ پائیدار ثابت ہوا۔ وہاں 638ء تا 650ء حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ عاملِ حکومت رہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ صفین کا تنازعہ نمٹانے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُن کی جگہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کا تقرر ہوا۔ 655ء

میں حضرت علیؓ نے عثمان بن حنیف کو بصرے کا اور عمار بن شہاب کو کوفے کا عامل بنا کر بھیجا۔ زیاد بن ابیہ جسے امیر معاویہؓ نے 666ء میں بصرے کا عامل مقرر کیا تھا' 670ء میں سارے عراق کا عامل بن گیا اور اپنی مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوئے اس نے ملک میں امن و انتظام بحال کر دیا۔ 673ء میں اُس نے اپنے بھائی امیر معاویہؓ سے قبل وفات پائی۔ 55ھ /675ء میں اُس کا بیٹا عبیداللہ بصرہ اور کوفہ کا عامل مقرر ہوا۔ اُس کے عہد میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔

بصرہ کے حالات میں ایک زبردست تبدیلی اُن پُرآشوب ایام میں رونما ہوئی جب یزید کی موت (64ھ /683ء) کے بعد بصرے کے شمالی علاقے کے عرب بنو تمیم اہل کوفہ کی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جا ملے۔ کچھ عرصے کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا کہ عراق بنو اُمیہ کے قبضے سے نکل گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے' جو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے' مکہ مکرمہ میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔ انہوں نے عراق میں اپنے عامل مقرر کیے۔ چھاپہ مار فوج کا سالار سردار مختار 686ء میں بصرہ کے عامل کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا' لیکن وہ اگلے ہی سال کوفہ کے نزدیک حرورا کی جنگ میں مارا گیا۔ حضرت مصعب بن زبیرؓ کی وفات نے صورتِ حال یکسر بدل دی۔ اُن کا بہترین سردار مہلب عبدالملک سے مل گیا اور بصرہ میں ایک بار پھر حکومتِ دمشق کی طرف سے عامل مقرر کر دیا گیا (692ء)۔

خوارج ایک مستقل بے اطمینانی اور بدامنی کی جڑ تھے۔ وہ سارے عراق اور اس کے نواح میں خوزستان کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں مستقل طور پر کبھی غلبہ حاصل نہ ہو سکا اور دوسری تمام جماعتیں اُن کی مخالفتیں کرتی رہیں۔ کبھی کبھی کوفہ اور بصرہ کا ایک ہی عامل مقرر کر دیا جاتا تھا' لیکن ایسی صورت میں عاملِ اعلیٰ کے ماتحت نائب عامل کام کرتے تھے۔ 694ء سے کوفہ میں حجاج بن یوسف کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ اسے عبدالملک نے کُل عراق کا عامل مقرر کیا تھا۔ اُس نے اپنی اعلیٰ انتظامی قابلیت سے کام لیتے ہوئے ساری بغاوتوں کو کچل دیا۔ اہل بصرہ کی بغاوت' جنہوں نے مدعیٔ خلافت عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کا ساتھ دیا تھا' 702ء میں فرو کر دی گئی۔ حجاج نے کوفہ اور بصرہ کے شہروں کی شورش پسندانہ سرگرمیاں ختم کرنے کے لیے بڑے مؤثر اقدامات اختیار کیے۔ اُس نے شہر واسط کو عراق کی اقتصادی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جو دجلہ کے کنارے واقع تھا اور جہاں سے کوفہ اور بصرہ بھی زیادہ دور نہیں تھے اور اُن پر بآسانی حکومت کی جا سکتی تھی۔

عبدالملک اُموی کی انتظامی اصلاحات سے بھی عراق کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان اصلاحات کا بنیادی اصول اتحاد تھا' جس کے بغیر صحیح ترقی ناممکن تھی۔ ان میں سب سے اہم اصلاح سکّوں (کرنسی) کے بارے میں تھی۔ اس پر پہلی بار 694ء میں عمل کیا گیا اور رائج الوقت بوزنطی اور ایرانی سکّوں کی جگہ عربی سکے استعمال ہونے لگے' اگرچہ تانبے کے بعض سکوں پر قدیم علامات اور نشانات بدستور قائم

رہے۔ چنانچہ سلطنت کے بعض حصوں میں (کچھ عرصے تک) چاندی کے سکوں پر خسرو کی شبیہہ آتش کدے کی تصویر کے ساتھ بدستور کندہ ہوتی رہی' صرف حاشیے پر کلمۂ طیبہ لکھ دیا گیا۔ عبدالملک کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ڈاک کا محکمہ قائم کیا' اگرچہ اُس وقت اُس سے محض سرکاری پیغامات اور اہلکاروں ہی کو لانے لے جانے کا کام لیا جاتا تھا۔ بالآخر عربی حکماً سرکاری زبان قرار دی گئی۔ قبل ازیں سرکاری دستاویزات ملکی یا غیر ملکی اور عربی زبانوں میں تحریر کی جاتی تھیں۔

ولید بن عبدالملک کے عہد میں بھی حجاج بن یوسف اپنے امتیازی منصب پر برقرار رہا۔ حجاج کی انتظامی خوبیوں کے باوجود اس کے نظم ونسق میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس نے ساری سلطنت کی ترقی پر بہت برے اثرات چھوڑے' اور وہ عنصر تھا اپنے ہم وطنوں بنوقیس کی جا و بے جا حمایت جو کہ شمالی عرب کے رہنے والے تھے۔ اسی وجہ سے وہ تمام یمنی جو فوج یا حکومت کے دوسرے شعبوں میں ملازم تھے اور وہ سارے باشندے جو اہل یمن کے حامی تھے' اس کے خلاف ہو گئے۔ اسی طرح علوی بھی اس کے سخت مخالف تھے' کیونکہ اُن کے تمام دعووں کو اُس نے سختی اور بے دردی سے دبا دیا تھا۔ حجاج نے ان تمام لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ اس کی متشددانہ کارروائیوں سے جو شدید کشاکش پیدا ہو گئی تھی' اُس نے بڑھ کر جنگ وفساد کی شکل اختیار نہ کی' کیونکہ الولید محتاط اور دانش مندانہ حکمت عملی سے کام لے کر بنوقیس اور اہل یمن کے درمیان خانہ جنگی روکنے میں کامیاب رہا' لیکن ولید کے وفات پاتے ہی طوفان پھٹ پڑا' کیونکہ اُس کا بھائی اور جانشین سلیمان بن عبدالملک حجاج کے دشمنوں یعنی یمنیوں کے زیر اثر تھا۔ بہرحال حجاج اس تکلیف دہ انقلاب سے بچ نکلا' کیونکہ وہ خود ولید سے چھ ماہ پیشتر وفات پا چکا تھا۔

سلیمان بن عبدالملک کے مسند خلافت پر بیٹھنے سے جو نیا دور شروع ہوا' اُس کا سب سے پہلا واقعہ یہ ہے کہ یزید بن مہلب کو' جو ایک بہادر اور مدبر سردار تھا' عراق کا عامل مقرر کر دیا گیا (714ء)۔ نئے عامل کے مقرر ہوتے ہی شمالی عربوں کی جماعت کے ممتاز ترین افراد کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان سے نہایت ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ سلیمان کے انتقال کے بعد مختلف دھڑوں کی حکومت شروع ہو گئی۔ جب کبھی تخت پر کوئی نیا خلیفہ بیٹھتا تو لوگوں کے دلوں میں ناقابل برداشت حد تک خدشات وخطرات پیدا ہو جاتے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز بن مروان نے کچھ عرصہ کے لیے یزید بن مہلب کو قلعۂ حلب میں قید کر کے اس کی کارروائیوں کا سدباب کر دیا۔ لیکن ابھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو وفات پائے زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ یزید قید خانے سے فرار ہو گیا اور اُس نے فوراً بصرہ میں بغاوت برپا کر دی جسے مسلمہ بن عبدالملک نے فرو کیا۔

اُس کے بھائی یزید ثانی نے بطور انعام اسے خراسان' بصرہ اور کوفہ کا عامل بنا دیا۔ مسلمہ نے ان مقامات پر علیحدہ علیحدہ اپنے نائب مقرر کیے۔ ہشام نے خالد بن عبداللہ القسری کو عراق کا عامل بنا دیا'

جس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ ہشام کی وفات کے ساتھ ہی ساری مملکت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مکمل انتشار رونما ہونے لگا اور جوش و ہیجان کا اظہار ہونے لگا۔ ہر قسم کے اختلافات نے شمالی عربوں اور جنوبی عربوں کی مخاصمت میں شامل ہو کر' اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ولید ثانی کی (جو ہشام کے بعد خلیفہ ہوا) ہمدردی بنو قیس سے جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس نے عبداللہ القسری کو بڑے ظالمانہ طریق سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مروان ثانی نے اپنے عہد میں (744ء۔750ء) ایک بار پھر بغاوتیں فرو کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ اُس نے عراق میں خوارج کا فتنہ بھی دبا دیا' لیکن ابوالعباس السفاح اور ابوجعفر منصور جیسے ہوشیار عباسیوں نے خراسان میں جو آگ بھڑکائی تھی' اسے بجھانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اُن کے سپہ سالار ابومسلم خراسانی نے مروان ثانی کے عامل نصر بن سیار کے خلاف 748ء میں فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔ عراق کا عامل ابن ہبیرہ بھی اس فتنے کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کوفے میں یمنیوں نے بغاوت کر دی اور شہر دشمن کے حوالے کر دیا' جسے کچھ عرصے کے لیے عباسیوں نے اپنا صدر مقام بنا لیا۔ 750ء میں خود مروان کو زاب اعلیٰ کے مقام پر قطعی شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بنوعباس نے بنواُمیہ کی جگہ لے لی۔

ایک لمحے کے لیے ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے' یہ بھی یاد رہے کہ امیر معاویہؓ اپنی دانش مندانہ حکمتِ عملی سے کام لے کر بہت تھوڑی مدت میں عراق میں اپنی حکومت مستحکم کرنے اور اسے عربی اور اسلامی تہذیب کے رنگ میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کی اس حکمت عملی کا ثبوت اس امر سے خاص طور پر ملتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کے رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوئے فوج میں علاقائی عسکری ملازمت کا اصول رائج کر دیا۔ پہلے جہاں عراق کی فوج غیر ملکی ہوتی تھی اور اُس کے دستے صرف چند ایک مقامات پر متعین ہوتے تھے' وہاں اب بے شمار نومسلم بڑی تعداد میں بھرتی ہونے لگے۔ اس بات سے کہ یہ فوجیں ملک سے باہر نہیں بھیجی جاتی تھیں اور صرف مشرقی مہمات میں استعمال کی جاتی تھیں' یہ نقصان ہوا کہ بنواُمیہ کے دشمن انہیں اپنا زبردست حامی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ابومسلم خراسانی نے عراقیوں اور ایرانیوں کو ساتھ لے کر بنواُمیہ کے خلاف جنگ کی' جن کے علَم کے نیچے صرف شامی تھے۔

شہری نظم و نسق کے سلسلے میں بھی امیر معاویہؓ اور ان کے جانشینوں نے مدبر ہونے کا ثبوت دیا۔ اگرچہ انہوں نے عراقیوں کو اپنا عامل منتخب کرنے کا حق نہیں دیا تھا' بلکہ ان پر حاکم مسلط کیے جاتے تھے' تاہم وہ ازراہِ عقل مندی عراقیوں کی درخواست مان لیتے تھے اور مختلف افراد کی تبدیلی عمل میں لے آتے تھے۔ لیکن یہ ایک بڑی غیر اہم سی رعایت تھی' جس سے ان کے نظامِ حکومت میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی۔ ان حاکموں نے یہ بخوبی سمجھ لیا تھا کہ عراق ایک زرعی ملک ہے جس کی زراعت کا

انحصار فلاحت (کاشت کاری) کے خاص خاص طریقوں پر ہے‘ اس لیے اس کا نظم ونسق چلانے کے لیے خاص توجہ درکار ہے اور ان حالات میں نہ تو حاکمانہ مداخلت موزوں ہے نہ مکمل عدم مداخلت۔ بارہا ایسا ہوا کہ مرکز کے نمائندوں نے ترقی کے بارے میں مقامی باشندوں کی تجاویز پر عمل درآمد کیا‘ مثلاً خلیفہ کے بھائی مسلمہ نے ایک نہر تعمیر کرائی۔ بنواُمیہ کے عہد میں عراق کو جو اقتصادی خوشحالی نصیب ہوئی‘ وہ اس لحاظ سے اور بھی قابل تعریف ہے کہ انہیں یہاں کے لوگوں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

بنوعباس کے طویل دورِ حکومت میں عراق کو بہت سے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا‘ جن کی تفصیل آئندہ شمارے میں پیش کی جائے گی۔

www.tanzeem.org

ہماری ویب سائٹ

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات

☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org